پنڈت آنند نرائن مُلّا

کی

ادبی خدمات

مُرتّبہ

خلیق انجم

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دلّی

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو ہند ۱۴۴۸ء

سنہ اشاعت : ——— ۱۹۹۵ء
قیمت : ——— ۴۰ روپے
بہ اہتمام : ——— ایم۔ حبیب خاں
تزئین کار : ——— انیس احمد
طباعت : ——— ثمر آفسیٹ پرنٹرز، نئی دلی

Pandit Anand Narain Mullah Ki Adabi Khidmat

EDITED BY **KHALIQ ANJUM**

Price 40.00
1995

ISBN-81-7160-069-7

ANJUMAN TARAQQI URDU (HIND)
URDU GHAR : 212 ROUSE AVENUE
NEW DELHI-110002

فہرست

حرفِ آغاز

پنڈت آنند نرائن ملاّ کی مادری زبان اُردو ہے۔ انھیں اُردو سے جو عشق ہے، اُس کا اظہار اُس فقرے سے ہوتا ہے جو انجمن کی جے پور میں منعقد ہونے والی آل انڈیا اُردو کانفرنس کے صدارتی خطبے میں شامل تھا، انھوں نے کہا تھا کہ:

"اُردو میری مادری زبان ہے۔ میں مذہب چھوڑ سکتا ہوں، لیکن اپنی مادری زبان نہیں۔"

ملاّ صاحب انجمن ترقی اردو (ہند) کے دس سال (۹ر اکتوبر ۱۹۷۲ء سے ۸ر اکتوبر ۱۹۸۲ء تک) صدر رہے۔ اپنی صدارت کے دوران میں وہ اُردو تحریک کے قافلہ سالار بنے رہے۔ ان کے زمانے میں صوبائی اور مرکزی حکومتوں کے ذمّے داران کو بڑی تعداد میں میمورنڈم پیش کیے گئے۔ اردو تحریک کو اُن کی رہنمائی میں غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔

ملاّ صاحب نے گجرال کمیٹی کے ایک جلسے میں اُردو کے سلسلے میں جو بیان دیا تھا، اس کی ایک تاریخی حیثیت ہے۔ انھوں نے اپنے بیان میں اُردو کی لسانی حیثیت پر عالمانہ تبصرہ کیا تھا اور ایک قانون داں کی حیثیت سے بتایا تھا کہ اُردو کو اس کا جائز حق نہ دے کر مرکزی حکومت کس طرح کا اخلاقی اور سیاسی جرم کر رہی ہے۔ اُنھوں نے دستورِ ہند کی مختلف دفعات کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا تھا کہ اُردو کو وہ حق ملنا چاہیے، جس کی ضمانت دستورِ ہند نے دی ہے۔ گجرال کمیٹی کی کئی سفارشات ایسی ہیں، جن کی بنیاد ملاّ صاحب کی تجاویز پر رہی ہے۔

ملّا صاحب کا شمار اُردو کے ممتاز ترین شاعروں میں ہوتا ہے۔ پچھلے پچاس ساٹھ برسوں میں اُردو شاعری میں جو چند معتبر اور منفرد آوازیں اُبھری ہیں ان میں ایک نمایاں آواز ملّا صاحب کی بھی ہے۔ ملا صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز انگریزی شاعری سے ہوا، لیکن خُدا کا شکر ہے کہ بہت جلد وہ اُردو کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اردو میں ان کا شعری سرمایہ بیش بہا ہے۔ ملا صاحب شاعر بھی ہیں اور نثر نگار بھی اور دونوں پر انھیں زبردست قدرت حاصل ہے۔

کچھ سال پہلے انجمن ترقی اردو (ہند) کی مجلس عاملہ نے فیصلہ کیا تھا کہ ملّا صاحب کا جشن منایا جائے۔ اس موقع پر ایک سیمینار منعقد ہوا جس میں ان کی شخصیت اور فن پر مقالے پڑھے گئے۔ یہ سیمینار ہماری توقع سے کہیں زیادہ کامیاب رہا۔ اس سیمینار میں پڑھے گئے تمام مضامین مرتّب کر کے شائع کیے جا رہے ہیں۔

خلیق انجم

ڈاکٹر کمال احمد صدیقی

آنند نرائن ملّا

ہر بڑا فن کار صاحبِ طرز ہوتا ہے۔ آنند نرائن ملّا کے بڑے شاعر اور صاحبِ طرز شاعر ہونے میں کلام نہیں۔ اس بات کا احساس خود اُن کو بھی ہے:

پاکیِ ذوق نے ملّاؔ مجھے چلنے نہ دیا
کسی اُس راہ پر جو ہو چکی گام آلودہ

یہی بات ایک دوسرے طریقے سے ایک اور مقطع میں کہی ہے:

وادیِ شعر میں یہ جادۂ ملّاؔ تو نہیں
اک الگ ہٹ کے نشانِ کفِ پا ہے تو سہی

آنند نرائن ملّا نے اس بات کا تو بے باکی سے ذکر کیا ہے کہ ان کا رنگِ سخن دوسروں سے مختلف ہے۔ لیکن اپنی شاعرانہ شخصیت کے بارے میں تعلّی سے پرہیز کیا ہے۔ حالاں کہ شعر میں تعلّی جائز بھی ہے اور روا بھی رکھی گئی ہے۔ یہ بات ملّا صاحب کی مخصوص افتادِ طبع اور ذہنی تربیت کا پتا بھی دیتی ہے۔ انھوں نے جاگیردارانہ ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں، اور آج اگرچہ وہ اس نظام کو آدرش نظام نہیں سمجھتے، سرمایہ دارانہ نظام کو بھی آدرش نظام نہیں سمجھتے۔ لیکن ان کو وہ آداب بہت عزیز ہیں جو ان کو بزرگوں سے ملے۔ ملّا صاحب خود شائستگی کا جیتا جاگتا نمونہ ہیں سماج اور سماج کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے معاملات کے بارے میں ان کا ایک رویّہ ہے۔ یہ نظریہ میں نے جان بوجھ کر نہیں قائم کیا ہے کیوں کہ نظریہ ہر جگہ ایک ہم آہنگی چاہتا ہے۔ ملّا صاحب نظریہ پر رویّہ کو سبقت دیتے ہیں۔ رویّے کا تعین اخلاق سے اور نظریہ کا اقدار سے ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ ملا صاحب اقدار یا ان کی اہمیت سے واقف نہیں ہیں۔ لیکن شعوری سطح پر بھی وہ رویّے کو قدرِ اول سمجھتے ہیں۔ جب بھی کہیں کوئی بری انسانیت سوز بات

ہوتی ہے تو ان کو تکلیف ہوتی ہے۔ اور اس تکلیف کو وہ شعر کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔
امیر مینائی نے کہا تھا:

خنجر چلے کسی پہ، تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

آنند نرائن ملاؔ کے یہاں سارے جہاں کا درد مختلف نظموں اور غزلوں میں طرح طرح سے ظاہر ہوا
دوسروں کا درد جب ان کا درد بن جاتا ہے تو شعری تخلیق سرانجام پاتی ہے۔ ان کا دل بھی گداختہ ہے۔
اس لیے وہ دوسروں کے دلوں کی کسک کو سمجھتے ہیں۔ اور اس طرح اپنے ماحول اور اپنی دنیا سے اور
اس میں رہنے والوں سے دردِ مشترک کا رشتہ قائم کرتے ہیں جو ان کو بہت عزیز ہے۔
ملا صاحب نے اپنے تیسرے مجموعے کلام "میری حدیثِ عمرِ گریزاں" میں اپنے پڑھنے والوں کے
نام ایک خط لکھا ہے۔ وہ ایک باقاعدہ مقدمہ بھی لکھ سکتے تھے۔ لیکن عدالت عالیہ میں مقدموں کے
فیصلے کرنے، اور اس سے پہلے اور بعد عدالتوں میں مقدموں کی پیروی کرنے کی وجہ سے اس لفظ کی وہ معنویت
اور وابستگی ان کے لیے نہ ہو جو مضمون اور مقدمہ نگاروں کے لیے ہوتی ہے۔ اپنے اس خط میں بڑے
بے ساختہ اور بے تکلف انداز میں انھوں نے شعر و ادب اور شاعر کے فرائض اور کردار کے بارے میں
اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔ لکھتے ہیں:

میرے نزدیک دنیا آج اس مقام پر پہنچ گئی ہے۔ جہاں صرف اسی دیوانے کی سماج میں گنجائش ہے۔ جس کی دیوانگی پروردۂ خرد ہے۔ اور وہ دیوانگی جس کے رشتے خرد سے ٹوٹ چکے ہیں۔ حیاتِ انسانی کے لیے مُضر ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جنون و خرد کا جو مفہوم میرے ذہن میں ہے۔ وہ یہاں پیش کر دوں۔ یہ اس لیے ضروری ہو جاتا ہے کیوں کہ میں نے اکثر اپنے اشعار میں جنوں کو خرد پر ترجیح دی ہے، اور بظاہر یہ میرے اوپر والے (یعنی پہلے کے) بیان کی تردید کرتا ہے۔ جنوں دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جو کسی مشترکہ انسانی مفاد کے آگے اپنا ذاتی مفاد نہیں دیکھتا، بلکہ کسی ایسے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ دوسرا جنون وہ ہوتا ہے

جو نراج چاہتا ہے اور جو اپنی ذاتی آرزوئیں اور اغراض پورے کرنے کے لیے سماج اور اخلاق کی صالح پابندیوں کو زنجیریں سمجھتا ہے اور انھیں توڑ کر اپنے انفرادی تقاضے پورے کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ پہلی قسم کا جنون ایک شریف انسان کے دل میں پرورش پاتا ہے۔ اور دوسری قسم کا جنون ایک بیمار غیر متوازن ذہن میں۔ میں نے جس جنون کو سراہا ہے۔ وہ پہلی قسم کا جنون ہے، نہ کہ دوسری قسم کا جنون۔"

ملا صاحب کو انانیت اور انسانیت کو فلاح عزیز ہے اور جنون کی تعریف کے پیرائے میں انھوں نے اپنا رویہ واضح کیا ہے۔ فرد اور سماج کے رشتے کو انھوں نے اور بھی واضح کیا ہے۔ لیکن اس وقت میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں۔ ملا صاحب جس جنون کی حمایت کرتے ہیں وہ خرد کا پروردہ ہے۔ یعنی یہ دیوانگی، ہوشیاری کی سب سے بلند سطح ہے۔ ظاہری طور پر ان کے جنون اور اقبال کے عشق میں ایک بُعد ہے بلکہ تضاد بھی معلوم ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جنون اور مصلحت کی جو کشمکش ملاؔ کے یہاں ہے۔ وہی اقبال کے یہاں عشق اور عقل کی کشمکش ہے۔ کشمکش ایک ہی ہے، استعارے اور ارشادیت میں ناموں کا فرق ہے۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اقبال کی بات چھڑ گئی ہے، تو اقبال سے جو تعلق خاطر ملاؔ کو ہے اس سے کترا کے گزر جانا مناسب نہ ہوگا۔ آنند نرائن مُلاؔ نے شاعری ہی اقبال کے ترجمے سے شروع کی۔ یوں بھی ملاؔ اور اقبال میں کشمیر، بلکہ ترک کشمیر قدر مشترک ہے۔ اقبال کے اجداد ڈھائی سو برس پہلے برہمن تھے اور کشمیر میں مسلمان ہو گئے تھے۔ پھر انیسویں صدی کے وسط میں ان کے دادا کشمیر سے ترک وطن کر کے سیالکوٹ میں آ بسے۔ آنند نرائن ملاؔ کے سگڑ دادا پنڈت سیتارام اٹھارہویں صدی کے آخر میں کشمیر سے ترکِ وطن کر کے آئے اور لکھنؤ میں آباد ہوئے۔

پنڈت جگت نرائن ملاؔ لکھنؤ کے مشہور وکیل تھے۔ اور جج کے اعلا منصب پر بھی فائز رہے۔ آبائی مکان رانی کٹرہ میں ۲۴ر اکتوبر ۱۹۰۱ء کو آنند نرائن ملاؔ پیدا ہوئے۔ چار پانچ برس کی عمر میں بسم اللہ مولانا برکت اللہ فرنگی محل نے اردو سے کرائی۔ بعد میں انھیں سے فارسی کا درس بھی لیا۔ ۱۹۲۳ء میں انگریزی

میں ایم اے اور ۱۹۲۵ء میں قانون کے امتحان پاس کیے۔ ۱۹۲۵ء میں بیماری کے زمانے میں شعلۂ طور کے عنوان کے تحت اقبال کے جو قطعات تھے، ان کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ غالبؔ، انیسؔ اور اقبالؔ سے خاص طور پر متاثر رہے۔ شاعری میں فکری عنصر کی اہمیت کے قائل تھے، اس لیے اپنے عہد کے لکھنؤ کے شاعروں میں انھوں نے خود کو سراج لکھنوی کے قریب پایا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ لکھنؤ میں انشاؔ، مصحفیؔ، میرؔ، آتشؔ، انیسؔ اور چکبستؔ وغیرہ کی روایت کے باوجود ملازموں کی شاعری زیادہ ہوئی۔ سراج نے غزل میں لکھنؤ کی زبان کے بانکپن کو برقرار رکھتے ہوئے تلازموں سے ہٹ کر شعر کے فکری پہلو پر زور دیا۔

ملاؔ کے ذہن پر اقبال کی شاعرانہ شخصیت کی گرفت رہی ہے۔ ان کی شروع کی بعض نظموں کے عنوان، اقبال کی نظموں کے عنوان ہیں۔ اور یہ نہ تو توارد ہے، اور نہ اقبال سے مقابلے کی کوشش ہے۔ اور تو اور مسدس کا فارم جو اقبال کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ لیکن اقبال کو پسند تھا۔ انیسؔ اور دبیرؔ کے مرثیے بھی مسدس ہی کے فارم میں ہیں۔ اقبال نے یہ فارم "مدوجزر اسلام" (مسدس حالی) سے لیا۔ اُسی فارم میں ملاؔ کی پہلی نظم "پرستارِ حسن" ہے۔ اور اس کی بحر بھی اقبال کی محبوب بحروں میں سے ہے[1]۔ ۱۹۲۶ء کی اس نظم کے پہلے دو بند ملاحظہ ہوں۔

اپنے سوزِ غم کی شرح داستاں کیوں کر کروں
دل کی جو باتیں ہیں وہ نذرِ زباں کیوں کر کروں
بات جو مجھ سے پنہاں ہے، بیاں کیوں کر کروں
اپنی ہستی کو زمانے پر عیاں کیوں کر کروں
دردِ دل کو غم کہوں، الفت کہوں، سودا کہوں
میں یہی حیران ہوں کس سے کہوں اور کیا کہوں

اے شعاعِ برق زا اے خادرِ پہنائے حسن
اے شرابِ دل گداز ساغرِ مینائے حسن

---

[1] رمل مثمن محذوف الآخر۔

اے شرارِ عقل سوزِ شعلۂ سینائے حُسن
اے نگاہِ فتنہ خیز دیدۂ بینائے حُسن
تو نے سینے میں یہ کیسا درد پیدا کر دیا
میری ہستی کو مرے دل سے تُنا سا کر دیا

مسدس ہی کے فارم میں ان کی دوسری نظم "شمع" ہے۔ یہ بھی ۱۹۲۶ء کی ہے۔ ۱۹۲۶ء ہی کی ایک اور نظم ہے "انسان" یہ بھی مسدس کے فارم میں ہے ۱۹۲۶ء ہی کی نظم "شاعر" بھی ہے۔ اور مسدس کے فارم میں۔

یہ لہجہ بھی اقبال کا ہے، مصرعوں میں الفاظ کا در و بست اور بات کہنے کا ڈھنگ بھی اقبال کا ہے لیکن یہ اقبال کی نقالی نہیں ہے۔ فکر اقبال اور رنگِ اقبال کی توسیع ہے۔

اقبال سے ملاّ کی عقیدت بڑی والہانہ ہے۔ لیکن جب انھوں نے مرتب طریقے سے کلام اقبال کا مطالعہ کیا۔ تو یہ بات ان کو کھٹکی کہ اقبال ایک بڑے دائرے سے ایک چھوٹے دائرے کی طرف گئے۔ ایک طرف قدیم ہند و حکما اور قرونِ وسطیٰ کے مفکروں نے اقبال کو متاثر کیا تھا اور دوسری طرف جدید مغربی علوم نے ان کی فکر کو جِلا کی تھی۔ فکر اقبال میں رندی اور قلندری کی جو شان تھی، وہ مذہب اور بین اسلامی تحریک کی طرف جھکاؤ سے ماند پڑ گئی۔ چناں چہ ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۵ء تک کی نظموں میں سے، ملاّ کی ایک نظم "اقبال سے شکوہ" بھی ہے۔ اس نظم کے چند شعر ہیں:

محمل میں چھپا ہے قیس حزیں دیوانہ کوئی صحرا میں نہیں
پیغامِ جنوں جو لایا تھا، اقبال وہ اب دنیا میں نہیں

تو وہ قطرہ تھا، جو رشکِ اربابِ نظر بن سکتا تھا
تو جا کے صدف میں کیوں بیٹھا جب یونہی گہر بن سکتا تھا

مذہب کی مینا کے قابل اے رند تری صہبا ہی نہیں
پوشاک جو تو نے پہنی ہے، قامت پہ ترے زیبا ہی نہیں

یہ پہلی نظم ہے، جسے ترکِ اقبال کہہ سکتے ہیں۔ یہاں سے ملا اپنا لہجہ دریافت کرتے ہیں اور یہ محض اتفاق نہیں کہ فکر، موضوع اور اسلوب، تینوں ایک ساتھ تبدیل ہوتے ہیں۔ اقبال سے ذہنی طور پر قطع تعلق کے بعد، ملاؔ کی آواز نئے لکھنؤ کی آواز بن جاتی ہے۔

آنند نرائن ملاؔ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ موضوع پر اس وقت تک فکر نہیں کرتے جب تک اسے اس لائق نہ سمجھیں کہ وہ شعر یا نظم میں ڈھل سکتا ہے۔ دل کے جس معاملے کو وہ شعر کے لیے انتخاب کر لیتے ہیں۔ پھر چاہے رسوائی ہو یا نیک نامی، وہ شعر میں باقی رہتا ہے۔ اور شعر بیاض ہی میں نہیں مجموعے میں بھی شامل ہوتے ہیں۔ انتخاب کرنے کے بڑے فائدے ہیں۔ لیکن انتخاب نہ کرنے کے بھی کم فائدے نہیں۔ ایک تو یہ کہ شاعر بہت ناپ تول کر بات کرتا ہے۔ اور مجموعی طور پر یہ بات ملاؔ کے بارے میں درست ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ شاعر کی فکر کے ارتقا کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

ملا صاحب ارتقا کے قائل ہیں، انقلاب کے نہیں۔ اس کا ذکر انھوں نے تحریروں میں بھی کیا ہے اور بات چیت میں بھی یہ ذکر آتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ انقلاب کے دلدادہ ہیں ۱۹۳۵ء کے لگ لگ انھوں نے ایک نظم کہی تھی۔ جس کے ٹیپ کے مصرعے اور عنوان دونوں میں انقلاب زندہ باد کا نعرہ ہے:

شوق ہوا بے حجاب
ختم ہوا دورِ خواب
آ گیا روزِ حساب
قوم کا چمکا شباب
زندہ باد انقلاب
انقلاب زندہ باد

توڑ پرانا نظام
دائرہ خاص و عام
بندشِ قوم و مقام

دے یہ جہاں کو پیام
یے کے اخوت کا نام
انقلاب زندہ باد

گویا انقلاب صرف اپنے وطن کے لیے نہیں۔ بلکہ ساری دنیا کے لیے چاہتے ہیں۔ سارے جہان کو پیام ہے۔ قوم و مقام کی بندش سے آگے۔

اس نظم کا آخری بند ہے:

سہل کن مشکلات
قوم کی راہِ نجات
دہر کا رازِ حیات
فلسفۂ کائنات
لاکھ سخن ایک بات
انقلاب زندہ باد

پھر، ۱۹۳ء کی ایک نظم ہے "ہم لوگ" فارم غزل کا ہے۔ اور اس زمین میں جگر مرادآبادی کی رندی اور سرمستی سے لبریز غزل ہے۔ ملاؔ نے اس زمین میں بھی انقلاب، اور وہ بھی انقلاب کے ایک مخصوص تصور کا نعرہ لگایا ہے۔ مطلع ہے:

سرخیٔ انقلاب ہیں ہم لوگ
عنفوانِ شباب ہیں ہم لوگ

نظم اس شعر پر ختم ہوتی ہے:

کون دے گا صدا پہ اپنی صدا
نعرۂ انقلاب ہیں ہم لوگ

ملاؔ صاحب باشعور شاعر ہیں، اور شعوری طور پر اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ نہ تو مزدور کو فرشتۂ رحمت سمجھتا ہوں، اور نہ مزدور راج قائم کرنے کے لیے کشت و خون کی ترغیب دینے ہی کو شاعری کا اصل مقصد قرار دیتا ہوں" ہر بات ملاؔ نے "جوئے شیر" میں "بقلم خود" کے عنوان کے تحت لکھی تھی۔ لیکن

اسی مجموعے میں نظموں کے علاوہ غزلوں میں بھی ایسے شعر ہیں۔ جو اس بات کی شہادت پیش کرتے ہیں کہ ملاّ کے نظامِ فکر میں انقلاب کا تصور مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ چناں چہ ۱۹۴۸ء کی ایک غزل کا مطلع ہے:

سنہرے خرمنوں میں رنگ پنہا دیکھ لیتا ہوں
ہر اِک دانے میں خونِ گرم دہقاں دیکھ لیتا ہوں

اس شعر میں غالب کے اس شعر کا فیض نمایاں ہے:

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے، خونِ گرم دہقاں کی

ابھی چند روز پہلے ملاّ صاحب سے اس موضوع پر پھر گفتگو ہوئی انھوں نے یہ بات دہرائی کہ میں تو سب کے لیے بھلائی چاہتا ہوں۔ انسان انسان سب برابر ہیں۔ میں نے کہا۔ ملاّ صاحب جب سماج طبقوں میں بٹا ہوا ہو، اور مختلف طبقوں کے مفادات مختلف ہوں۔ ایک کا سود دوسرے کا زیاں ہو، تو یہ بات کیسے مانی جائے گی کہ آپ ناوابستگی کے ساتھ سوچ سکتے ہیں۔ میں نے یہ بھی کہا کہ ملاّ صاحب آپ کی نظموں میں بھی اس بات کے واضح اشارے ہیں کہ آپ ظالم کے ساتھ نہیں، مظلوم کے ساتھ ہیں۔ ملاّ صاحب نے کہا کہ انصاف اور قانون کا تقاضہ ہے کہ ظالم کے مقابلے میں مظلوم کا ساتھ دیا جائے۔ اور میں مظلوم کے ساتھ ہوں لیکن اس کے باوجود مجھے اس پر اصرار ہے کہ انسان اور انسان، سب برابر ہیں۔ میں نے جب انھیں کے شعر مثال میں پیش کیے۔ تو انھوں نے کہا۔ میں نے اپنا موقف بیان کر دیا۔ آپ کو میری شاعری کے بارے میں اپنی رائے قائم کرنے کی اور اس پر قائم رہنے کا اتنا ہی حق حاصل ہے، جتنا مجھے اپنی رائے پر قائم رہنے کا ہے۔ پھر انھوں نے اپنی تازہ نظم سنائی۔ آپ بھی سنیے:

صد شکر کہ میں اک چڑیا ہوں
اک ننھی منی سی چڑیا
عقاب نہیں
شاہین نہیں
یہ چونچ مری تلوار نہیں

میرے پنجوں میں خون نہیں
میں اُڑتی ہوں اور گاتی ہوں
یہ دایومنڈل میرا ہے

چھوٹی چھوٹی چڑیو، آؤ

ہم اپنا پورا دل لے کر
اِک بادل بن کر چھا جائیں
اور اپنی کروڑوں چونچوں میں
چھوٹے چھوٹے کنکر لے کر
ان عقابوں پر برسائیں
شاہینوں پر پتھراؤ کریں
ان کے پنجے، بازو توڑیں
اور اپنے وایو منڈل میں
یہ خون و غارت بند کریں

●

صد شکر کہ میں چھوٹے قد کا
معمولی سا اِک انساں ہوں
میں دھرتی کا
دھرتی میری
یہ مٹی میری ماتا ہے
اور میں
اس کا مالک بھی ہوں
وارث بھی ہو
رکھوالا بھی
صد شکر کہ میں اک دیو نہیں
میرے دانتوں میں مانس نہیں
اور میرے نکیلے سینگوں سے
سینے میں کسی کے گھاو نہیں
اور میرے پیروں کے نیچے
کچلی ہوئی کوئی لاش نہیں

●

معمولی انسانو، آؤ
ہم سب مل کر ان دیووں کے
کی دیواریں توڑیں
محلوں کے چراغاں ختم کریں
ہر کٹیا میں اک دیپ جلے
اور سب مل کر اک جشن کریں
دھرتی کا نیا نغمہ گائیں

●

اب قصۂ شاہیں ختم ہوا
چڑیوں کا فسانہ آیا ہے
دیووں کا زمانہ بیت گیا
انساں کا زمانہ آیا ہے
آکاش کے تارے بجھنے دو
دنیا سے کہو ماتم نہ کرے
ذرّوں سے شعاعیں پھوٹیں گی
مٹی کی خدائی باقی ہے
صد شکر کہ میں اک چڑیا ہوں
صد شکر کہ میں چھوٹے قد کا
معمولی سا اِک انساں ہوں

●

نظم سننے کے بعد وہی خیال میرے ذہن کی سطح پر بھی اُبھرا، جو یقیناً اس وقت آپ کے ذہن میں ہوگا۔ "شاہین" اقبال کی محبوب علامت ہے۔ یہ شاہین قوت اور عمل کی علامت ہونے کے باوجود فاسشٹ رجحان کی طرف لے جاتا ہے۔ چڑیوں کے سماج میں شاہین کم اور کمزور چڑیوں زیادہ ہیں۔ بالکل جس طرح ہمارے سماج میں مُلّا نے خود کو انھیں چھوٹی اور ننھی منی چڑیوں سے کیا ہے۔ اور ایک جمہوری نظام کے قیام کے لیے اس بات کو ضروری سمجھا ہے کہ ننھی مُنی چڑیاں اپنی کروڑوں چونچوں میں کنکریاں لے کر عقابوں پر وار کریں اور ان کے پر توڑ دیں۔ ظاہر ہے یہ ارتقائے انقلاب کی طرف قدم ہے۔

ملّا صاحب سے میں نے پوچھا، قرآن پاک میں ایک آیت ہے اصحاب فیل کے بارے میں دشمن ہاتھیوں پر بیٹھ کر جنگ کرنے آئے تھے۔ چھوٹی چڑیوں کا ایک غول آسمان پر چھا گیا۔ انھوں نے کنکریوں کا مینہ برسایا اور اصحابِ فیل شکست کھا کر بھاگ گئے۔ ملّا صاحب نے کہا کہ قرآن پاک کی آیت شعوری طور پر بھی میرے ذہن میں تھی اور اس نظم میں یہ خیال وہیں سے آیا ہے۔

ملّا صاحب کے تین مجموعے اس وقت تک شایع ہو چکے ہیں۔ جوئے شیر ۱۹۴۹ء میں۔ اور اس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ دوسرا مجموعہ "کچھ ذرّے، کچھ تارے" ۱۹۵۹ء میں اتر پردیش کا غالب انعام جن دو کتابوں پر برابر تقسیم ہوا۔ ان میں سے ایک ملّا کی "کچھ ذرے کچھ تارے" اور دوسری فراق گورکھپوری کی "گل نغمہ"۔ تیسرا مجموعۂ کلام "میری حدیثِ عمر گریزاں" ۱۹۶۳ء میں شایع ہوا اور اس پر ساہتیہ اکاڈمی انعام دیا گیا۔

سیاسی موضوعات کے علاوہ سیاسی شخصیتوں پر بھی ملّا کی نظمیں ہیں۔ بہت سی ایسی نظمیں اور غزلیں بھی ہیں جن کا تعلق دل کی دھڑکنوں سے ہے۔ جب دل کی کسک شعر کے پیکر میں آتی ہے تو عشقیہ شاعری ہو جاتی ہے، اور پھر وہ نجی نہیں رہتی۔ ان میں ایسی نظمیں بھی ہیں جو بظاہر دوسروں کے واردات قلبی ہیں۔ لیکن جنھوں نے شاعر کو متاثر کیا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ سماج کے سارے اسپکٹرم پر ملّا کی نظر رہی ہے۔

دسمبر ۱۹۴۶ء میں آنند نرائن ملّا ایک انڈو پاک ٹربیونل کے صدر مقرر ہوئے تھے اور مارچ ۵۲ء تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ اسی زمانے کی ایک نظم ہے "سوغات" جو لاہور جاتے ہوئے سرانجام

پائی تھی، مسلسل غزل کا فارم ہے اور اس زمین میں کچھ کم تر درجے کے لوگوں نے بھی طبع آزمائی کی ہے مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ چند شعر یہ ہیں:

میں کیا آیا ہوں اک گزرا زمانہ لے کے آیا ہوں | پھر اک تجدیدِ الفت کا ترانہ لے کے آیا ہوں

سلامِ شوق و نذرِ دوستانہ لے کے آیا ہوں | بہ نامِ خطۂ اقبال خاک میرؔ و غالبؔ سے

محبت کی شکست فاتحانہ لے کے آیا ہوں | مجھے ٹھکرا نہ پاؤ گے، تمھیں اپنا بنا لوں گا

ملاؔ کی یہ نظم ہندستان اور پاکستان میں یاد رکھی جائے گی۔ کیوں کہ جو بات انھوں نے اس نظم میں کہی تھی وہ انھیں کے دل کی بات نہیں، بلکہ ہر ہندوستانی کے دل کی بات ہے۔ ملک تقسیم ہوگیا۔ ہم یہ نہیں چاہتے تھے۔ لیکن اس تقسیم کے بعد ہندوستان میں عوام نے ہمیشہ یہ چاہا سرحدیں زمین پر کھنچی ہیں۔ دلوں پر یہ سرحدیں نہ کھنچیں۔ اور ہم اچھے پڑوسیوں کی طرح ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک رہیں۔ اس کے باوجود سرد اور گرم، دونوں طرح کی جنگوں سے ہمیں گزرنا پڑا۔ پھر بھی ہمارے خیالات اور ہمارے جذبات آج بھی وہی ہیں۔ جن کی ترجمانی ملاؔ نے اس نظم میں کی ہے۔

الٰہ آباد ہائی کورٹ کے جج کی حیثیت سے آنند نرائن ملاؔ نے کچھ ایسے فیصلے بھی تحریر کیے جن کا چرچا سارے ملک میں رہا۔ جج کا منصب قانون کو انٹرپریٹ کرنا ہے۔ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کو یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ اگر قانون میں کوئی نقص ہو، تو وہ قانون کو کالعدم قرار دے دے عدالتِ عالیہ میں بھی ملاؔ صاحب کے شاعرانہ بانکپن نے ایک روایت قائم کی۔ چناں چہ ایوانِ عدالت سے رخصت ہوتے ہوئے انھوں نے جو مسلسل غزل کہی۔ اس کے کچھ شعر اس بانکپن کا آئینہ ہیں:

مجھ سا کوئی پروانہ پھر آئے کہ نہ آئے | یہ ہمت مردانہ پھر آئے کہ نہ آئے

یوں حرفِ حریفانہ پھر آئے کہ نہ آئے | طاقت کی رعونت کے مقابل بہ لبِ عدل

ساقی سے ہوا، تشنہ لبوں سے تھا جسے اُنس — محفل میں وہ پیمانہ پھر آئے کہ نہ آئے

چنتی ہی رہی شیخ کی داڑھی کے جو تنکے — یہ جرأت رندانہ پھر آئے کہ نہ آئے

آتے ہی رہیں گے سرِ طور اور بھی موسٰی — یہ ضربِ کلیمانہ پھر آئے کہ نہ آئے

مسند پہ پہنچ کر بھی رہا حامی جمہور — مُلّا کا سا دیوانہ پھر آئے کہ نہ آئے

ہر شعر اپنی معنویت کے اعتبار سے ایک مکمل نظم۔ اور پورے نظام کو ناپنے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ جو باتیں مُلّا نے کہی ہیں، وہ شاید غزل کی رمزیت کے سہارے کے بغیر نہیں کہی جا سکتی تھیں۔

نیکی اور بدی میں ایک جنگ ہمیشہ سے جاری ہے۔ ملّا صاحب اس جنگ سے بہت اچھی طرح واقف ہیں۔ "بلسوا" مہاجن کی لڑکی، مزدور، عاشق، کلکتہ کے قحط زدہ لوگ، سب اس جنگ میں شریک ہیں۔ یہ جنگ ایوانِ عدالت میں بھی ہے اور تاریخ کے صفحات پر بھی۔ ملّا قنوطیت کی نہیں رجائیت کی بشارت دیتے ہیں۔ "میری حدیث عمر گریزاں" میں آخری نظم ہے۔ "اور اِک دن انسان جیتے گا" اس کے بعد ایک غزل اور دو شعر ہیں۔ نظم میں مختلف تلازموں خیر کی شکست اور شر کی فتح دکھائی ہے:

۱۔ پھر معرکہ خیر و شر میں نیکی ہاری شر جیتا
یہ جنگ مگر جاری ہے ابھی

۲۔ پھر دشت و چمن کے معرکے میں گلشن ہارا صحرا جیتا
یہ جنگ مگر جاری ہے ابھی

۳۔ حق اور ناحق کے معرکے میں پھر حق ہارا ناحق جیتا
یہ جنگ مگر جاری ہے ابھی

اور آخر میں بند لکھتے ہیں:

جب سے یہ دنیا قائم ہے
یہ جنگ برابر جاری ہے
اب تک تو یہی ہوتا آیا، انسان ہارا شیطاں جیتا
لیکن جب تک یہ دنیا ہے
یہ جنگ بھی ہوتی جائے گی میدان بدلتے جائیں گے
اور اِک دن انسان جیتے گا

یہ جائزہ تھا اس شاعری کا جس کو فکری شاعری کہہ سکتے ہیں۔ فکری شاعری کی اصطلاح کوئی بہت اچھی نہیں ہے۔ کیوں کہ فکر کے بغیر شاعری ممکن نہیں۔ کسی دوسری مناسب اصطلاح کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے اس سے بہتر اصطلاح سمجھ میں نہیں آتی۔ خارجی حقیقت اور داخلی حقیقت کی شاعری؟ خارجیت اور داخلیت زیادہ الجھن پیدا کرنے والی، اور گمراہ کرنے والی اصطلاحیں ہیں۔ اس لیے میں نے دانستہ طور پر ان سے احتراز کیا ہے۔ اب ملاؔ صاحب کی شاعری کے ایک دوسرے پہلو پر نظر نظر ڈالیں۔

سماجی اور خارجی حقیقتوں میں خود انسان کی ذات بھی شامل ہوتی ہے۔ پھر بھی ان کے بہت سے نجی مسائل، سماجی عوامل کی پیداوار ہونے کے باوجود، سماج سے کم اور اس کی شخصیت یا ذات سے زیادہ متعلق ہوتے ہیں۔ عشق بھی ایک ایسی ہی ایک قدر ہے۔ ملاؔ نے ایسی نظمیں اور غزلوں میں ایسے شعر بھی) لکھے ہیں۔ جن میں دوسروں کے عشق کو پیش کیا گیا ہے۔ اور یہاں عشق ایک سماجی مسئلہ ہے۔ سماجی مسئلہ ان معنوں میں کہ سماج کے بندھن۔ عشق میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ میرے نزدیک اس قبیل کی سب سے خوب صورت نظم ہے۔ "سماج کا شکار"۔ جو ۱۹۴۱ء کی نظم ہے۔ یہ ایک کہانی ہے۔

ایک مہاجن کی بیٹی کہتی ہے "جا پوچھ سکھی شور کیسا ہے گلی میں"۔ اور دو دو مربعوں کے چھ بندوں میں وہ بتاتی ہے کہ مزدور کا بیٹا ہر روز دن میں کئی کئی بار ادھر آتا ہے، سردی، گرمی، بارش کے باوجود وہ ضرور آتا تھا۔ پرسوں میری سالگرہ تھی۔ شوالے پوجا کے لیے جا رہی تھی کہ اس نے مجھے پھولوں کا ہار لا کر دیا۔ میں جلدی سے آگے بڑھ گئی اور اس سے بات بھی نہیں کی۔

اور نہ ہار لیا۔ دربان نے دور سے دیکھ لیا تھا، اس نے پتا جی کے نہ جانے کیا کان بھرے کہ انھوں نے جا کر اس کو بہت ڈانٹا۔ معلوم نہیں اس نے یہ تو نہیں سمجھا کہ میں نے پتا جی سے شکایت کی۔ وہ چپ چاپ پتا جی کی باتیں سنتا رہا، پتا جی کو پرنام کیا اور چلا گیا۔ اور اس کے بعد پلٹ کر نہ آیا۔ جا پوچھ سکھی ری شور یہ کیسا ہے گلی میں۔

وہ مزدور کا بیٹا کیسا نادان تھا کہ میرے جی کی بات نہیں سمجھا۔ وہ یہ بھی نہیں سمجھا کہ یہ تہذیب بھی جھوٹی ہے اور میری شرم بھی جھوٹی ہے۔ یہ سماج کتنا ظالم ہے۔ ایک بار وہ پھر ادھر آئے تو میں سماج اور دنیا کی پروا نہ کروں گی۔ رسوائی گوارا کروں گی۔ لیکن عشق کو رسوا نہ کروں گی۔

جاں ہوتی ہے پیاری مجھے اس کا تو یقیں ہے
دنیا بھی جوانی کی نگاہوں میں حسیں ہے
لیکن وہ جہاں رہتا تھا رونا یہ وہیں ہے
جو دل میں مرے شک ہے کہیں سچ تو نہیں ہے
جا پوچھ سکھی ری شور یہ کیسا ہے گلی میں

بیانیہ شاعری بہت مشکل ہوتی ہے۔ مثنوی اور واسوخت کی روایت کے باوجود، بیانیہ شاعری میں اثر پیدا کرنا مشکل اس لیے ہے کہ ایک تو قصّہ میں جان ہو۔ اب قصّے میں جان ہے تو نظم کے بجائے نثر اس کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ قصّہ کو سپاٹ طریقے سے بیان کرنے سے نظم نہیں بنتی۔ ملّا کے دل میں مہاجن کی بیٹی کے دل کا سارا درد سمٹ آیا ہے، اور اس طرح انھوں نے ایک خارجی حقیقت کو اپنے احساس اور اپنی کیفیت کے ساتھ نظم کیا ہے، یہ نظم اسی وجہ سے پُراثر ہے۔

اس سے پہلے کی ایک نظم ہے۔ "دوشیزہ کا راز" عنفوان شباب میں پہلی بار جب کسی پر اس کا دل آتا ہے، تو اُسے اپنی زندگی بامقصد معلوم ہوتی ہے۔

بے خبر فطرت سے اپنی فطرتِ معصوم تھی — یہ جو اک دل میں تڑپ ہے کل تلک معدوم تھی
آرزو اپنی مجھے اتنی فقط معلوم تھی — کوئی لذت تھی کہ جس سے زندگی محروم تھی
اب حقیقت زیست کی مجھ پر ہویدا ہوگئی — کل تلک انگور تھی میں آج صہبا ہوگئی

ملّا نے دوشیزہ کے جذبات کی بہت اچھی ترجمانی کی ہے۔ اس نظم میں ایک الجھن ہے۔ پہلے بند

سے یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ اپنی کسی سہیلی سے باتیں کر رہی ہے۔ لیکن آٹھویں بند میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی کسی سہیلی سے مخاطب نہیں ہے۔

مجھ سے کہتی تھیں مری ہمجولیاں اکثر یہی
مرد ہیں سارے کہ سارے بے وفا، خود مطلبی
آج ہے جس کی خوشامد، اس سے کل ہے بے رخی
ان کے بہکانے میں آتی، میں مگر ایسی نہ تھی
یا تو ان کے حسن میں میری سی رعنائی نہ تھی
یا کبھی ان پر کسی کی طبع یوں آئی نہ تھی

"طبع یوں آئی نہ تھی"۔ بظاہر یہ لکھنؤ کی زبان نہیں ہے۔ لیکن لکھنؤ میں ملاّ صاحب ہی لکھ سکتے تھے وجہ اس کی یہ ہے کہ کشمیری گھرانے فارسی کا ذوق اور فارسی کے الفاظ اپنے ساتھ لائے تھے۔ اور وہ ان کے گھروں میں رائج ہے۔ یہاں فارسی سے مراد وہ عربی الفاظ بھی ہیں جو فارسی میں رائج تھے، آنند نرائن ملاّ کی دادی، یعنی پنڈت کالی سہائے کی بیوی اور پنڈت لچھمی نرائن کی بہو تھوڑی بہت کشمیری جاننے والی آخری خاتون تھیں۔ کشمیری زبان کی روایت ختم ہو جانے کے باوجود فارسی کی روایت باقی رہی۔ لکھنؤ میں دھوپ سے بچنے کے لیے یوں کہتے تھے "وہاں کہاں بیٹھے ہیں اُدھر دھوپ ہے، یہاں آجائیے" لیکن لکھنؤ میں آباد کشمیری گھرانوں میں بول چال یہ تھی"۔ وہاں کیوں تشریف فرمائیں۔ اُدھر آفتاب ہے اِدھر تشریف لے آئیں"۔

شاید فارسی کی اسی روایت کی وجہ سے "طبع یوں آئی نہ تھی" خلافِ محاورہ نظم ہوا ہے۔ بات سے بات نکل آئی۔ بات اور ہو رہی تھی کہ نظم کے مخاطب کی۔ یہ مصرع؛

ان کے بہکانے میں آتی میں مگر ایسی نہ تھی

اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ نظم یا تو خود کلامی ہے، یا پھر محبوب کے نام خط ہے آخری بند سے یہ دو امکان بھی ختم ہو جاتے ہیں۔

لو جانے کیا کیے جاتی ہوں اپنے جوش میں
میں نہیں ہوں غالباً اس وقت اپنے ہوش میں

اب نہ آئے گی صدا میری کسی کے گوش میں
راز کو اپنے چھپاؤں گی لب خاموش میں

ہاں مگر جب تک یہ صبح خوشگوار آئی نہ تھی
گلشن جذبات میں میرے بہار آئی نہ تھی

یہ خود کلامی بھی ہوسکتی ہے۔ اس صورت میں نظم کا تانا بانا تصور پر ہے لیکن نظم میں جو شدید جذباتی کیفیت ہے وہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نظم کا شاعر کی زندگی میں بھی تعلق ہے۔ ہوسکتا ہے کسی خط نے۔ "یا کسی" کے کسی جملے نے اس نظم کے لیے فضا بنائی ہو۔

سماج میں نہ صرف دولت کی غیر مساوی تقسیم تھی بلکہ جاگیرداری اور سرمایہ داری کے ساتھ سامراج کا بھی غلبہ تھا۔ اور یہ سب ایک ہی زنجیر کی کڑیاں تھیں۔ سماج مردوں کا تھا۔ اس لیے عورت مظلوم تھی۔ ملا نے سماج کے ہر شعبہ سے متعلق نظمیں لکھیں۔ عورت کی مظلومیت کی داستان ابتدائی زمانے کی نظم "بیسوا" میں ہے۔ صرف ارباب نشاط ہی نہیں، گھر کی ملکہ بھی مظلوم ہے، اور ملاؔ نے اس نظم پر آنسو بہائے ہیں۔ ملاؔ رونے دھونے والے شاعر نہیں ہیں۔ ایک حساس دل رکھتے ہیں۔ اور اس حساس دل کی دھڑکن ان کے ہر شعر میں ہے۔

رفعت سروش

جادۂ مُلّا

بدلتی قدروں میں کچھ ہوں کہ کچھ نہیں مُلّاؔ
سوالیہ سا نشاں ہوں خود اپنے نام کے بعد

مجھے اس 'سوالیہ نشان' نے ہی یہ چند سطور لکھنے کی ترغیب دی ہے اور ظاہر ہے اس کا جواب بھی ملّا صاحب کی تحریروں کے گوشوں یا بین السطور میں ہی مل سکتا ہے۔ آج ملّا صاحب نوے سال کی عمر میں خود ایک زندہ روایت کا درجہ رکھتے ہیں مگر میرا ذہن اُس لکھنؤ کی طرف متوجہ ہے جہاں اس صدی کے شروع میں گھر گھر شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ کتنے ہی ایسے دیوان خانے تھے جہاں آئے دن مشاعرے ہوتے تھے۔ دس بارہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے ہر تیسرا نوجوان غزل گوئی کا اسیر ہو جاتا تھا۔ اور کسی نہ کسی استادِ فن کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کرتا تھا۔ ادبی معرکہ آرائی لکھنؤ کی شان تھی۔ یہ وہ لکھنؤ تھا جہاں صفیؔ لکھنوی، آرزوؔ لکھنوی، نواب جعفر علی خاں اور ان کے ہم عصر اردو غزل کی نوک پلک سنوار رہے تھے۔ اور لکھنوی رنگِ تغزل کو درجۂ کمال تک پہنچا رہے تھے ـــــ ان اساتذۂ سخن کے اثر سے کسی ذہین اور اردو داں نوجوان کا بچا رہنا ناممکن نہیں تو محال ضرور تھا۔

پنڈت آنند نرائن ملّا۔ کشمیری برہمن ہیں۔ اردو جن کی گھٹی میں پڑی ہے۔ جس لکھنؤ کی ادبی فضا کو پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ، دیا شنکر نسیمؔ اور برج نرائن چکبستؔ جیسے ادیبوں اور شاعروں نے قابلِ رشک بنایا تھا۔ آنند نرائن ملّاؔ نے پہلے نظم پھر غزل کے ذریعہ جادو جگایا۔ بیس بائیس سال کی عمر میں اپنی افتادِ طبع سے مجبور ہو کر شاعری شروع کی تو انگریزی میں ـــــ چھ سال تک اس بدیسی زبان کو اپنے جواہر پاروں سے مزین کرتے رہے ـــــ اور آخر براہِ راست نظم گوئی کی طرف مائل ہوئے ـــــ شعرائے اردو کی سوانح کا مطالعہ شاہد ہے کہ ہمارے مشہور ترین نظم گو شعراء بھی پہلے گیسوئے غزل کے

اسیر ہوئے۔ مثال کے لیے حالی، اقبال اور جوش کا نام لینا کافی ہے۔ یہ اختیار ملا صاحب کے حصے میں آیا کہ انھوں نے غزل سے دامن بچا کر نظم کو وسیلۂ اظہار بنایا۔ چناں چہ ملا صاحب کی تفہیم کے لیے ان کی نظم کا مطالعہ ضروری ہے۔ بدلتی قدروں میں ان کا کیا مقام اور مرتبہ ہے۔ اور اس سوال کا جواب بھی اسی میں مضمر ہے ـــــ مگر ملا صاحب کی غزل بھی قابل توجہ ہے اور انھوں نے اس روایتی گلشن میں بھی گل بوٹے کھلائے ہیں اگرچہ ان کی بیشتر غزلیں اس زمانے کی مروجہ زمینوں میں ہیں۔ اور غزل کی لفظیات سے بھی وہ زیادہ بغاوت نہیں کر سکے ہیں۔

دراصل اصناف سخن میں غزل ایک ایسی افیون ہے کہ ایک بار زبان اس کے ذائقہ سے آشنا ہو جائے پھر۔

ع چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

مگر غزل کے اس کافرانہ مزاج کا ملا صاحب کو احساس رہا اس لیے وہ کلی طور پر اس کے دام میں نہیں آئے اور یہی ان کی دیدہ وری کی دلیل ہے ؎

زمانہ کروٹوں پر کروٹیں لیتا ہے اے ملا   مگر اب تک وہ خواب آور غزل خوانی نہیں جاتی

اور جب وہ صنف غزل سے ان الفاظ میں مخاطب ہوتے ہیں کہ ؎

دیا دردِ انساں کا احساس تجھ کو   کھڑا کر دیا نظم کے پاس تجھ کو

تو گویا یہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ وہ نظم کو غزل سے بہتر تصور کرتے ہیں مگر اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ ملا صاحب نے اچھی غزل نہیں لکھی۔ ان کی غزلوں میں بھی اچھوتے مضامین ہیں۔ اور غزل کے روایتی رنگ و آہنگ میں پورے دروبست کے ساتھ ؎

وادیٔ نور بن گئی یہی شعلوں کی زمیں   ابھی مٹی کے فرشتے سے میں مایوس نہیں

بیماریٔ انساں کم نہ ہوئی جتنے بھی طبیب آئے اب تک
یا جسمِ انساں بھول گئے یا روحِ انساں بھول گئے

ملا صاحب کی غزل کا تجزیہ ایک الگ مضمون کا متقاضی ہے اور اسے یوں چند جملوں میں تمام نہیں کیا جا سکتا میں اس وقت ان کے دبستانِ نظم کی سیر کرنا چاہتا ہوں کہ ان کے تخلیقی جوہر کا پہلا پھول اِسی

دبستاں میں کھلا۔

اردو میں نظم گوئی کوئی نئی صنف نہیں۔ اس کی روایت کئی سو سال پرانی ہے۔ ہمارا پہلا اور بے حد اہم نظم گو شاعر نظیر اکبرآبادی ہے اس کے علاوہ مثنویوں اور مرثیوں میں ایسے بہت سے ٹکڑے ملتے ہیں۔ جو آزادانہ طور پر کسی مخصوص موضوع پر نظم کے ذیل میں آتے ہیں، پھر شہر آشوب وغیرہ میں مثالیں دے کر مضمون کو طویل نہیں کرنا چاہتا۔ اہل نظر واقف ہیں۔ البتہ باقاعدہ نظم نگاری کی تحریک ۱۸۶۷ء میں مولانا محمد حسین آزاد، حالیؔ، کیفی، اور ان کے رفقاء کی توجہ سے شروع ہوئی اور اس میں مغربی ادب کے مطالعہ کے اثرات کارفرما تھے پھر اردو نے اقبال جیسا بلند قامت نظم گو پیدا کیا جس نے اردو شاعری کی کایا پلٹ دی اور اقبال کے تتبع میں یا ان کی شاعری کی مقبولیت کے باعث بہت سے نظم گو شعراء پیدا ہوئے جن کی فہرست طویل ہے مثال کے طور پر جوش ملیح آبادی، سیماب اکبرآبادی اور ان کے بعد حفیظ، احسان دانش، اور روشن وساغر کے نام لینا کافی ہیں۔ ان حضرات کی شاعری کو نہایت سازگار ماحول ملا ملک کی جنگِ آزادی کا اور بیشتر اردو نظم ترانۂ آزادی کے رنگ و آہنگ میں ڈھل گئی نئے نئے زاویوں سے ملک کی عظمت اور بدیسی حاکموں کی خدمت، آزادی کی عظمت، جذبۂ بغاوت اور ذوقِ شہادت کو اردو شاعروں نے پیش کیا اور یہ شاعری دیوان خانوں سے نکل کر پبلک جلسوں اور سیاسی پلیٹ فارم تک پہنچ گئی —— انڈین نیشنل کانگریس کے جلسے ہمارے مقبول شاعروں کے کلام سے شروع ہوتے تھے۔ یہی وہ دور ہے جب آنند نرائن ملاؔ انگریزی شاعری کے ایوان سے نکل کر اردو شاعری کے میدان میں آئے وہ کانگریس کے تاریخی جلسوں میں روشؔ اور ساغرؔ کے دوش بدوش نغمہ فگن نظر آتے ہیں اس زمانے میں ان کا مشہور ترانہ تھا۔

زندہ بادِ انقلاب، انقلاب زندہ باد

ملاؔ صاحب کی شاعری کا ایک پہلو غنائیہ ہے اور انھوں نے بہت سے ایسے وطنی نغمے لکھے جو ہزاروں لوگوں نے گائے ؎

زمین وطن، اے زمین وطن

جہاں اک کنول پر یہ صد دلبری ۔۔۔ اٹھی دودھ کے کنڈ سے لکشمی
قدم شیو کے شانوں پہ دھرتی ہوئی ۔۔۔ اتر آئی گنگا جہاں خندہ زن

زمینِ وطن، اے زمینِ وطن

اس نظم میں ہندوستان کی تہذیبی اور ثقافتی عظمت انگریزوں کے مظالم آزادی کی تڑپ اور اخوت و اتحاد کا پیغام سب کچھ ہے۔ ان کی اس طرح کی نغماتی نظموں میں ایک نظم گاندھی جی کی موت کے بعد "جادۂ امن" ہے ؎

لیے نوید امن و مژدۂ اماں، بڑھے چلو
علم لیے شہید قوم کا نشاں بڑھے چلو
بدل بدل کے رنگ ابھر رہا ہے فتنۂ جہاں
فن و ادب کو بھی پہنائی جارہی ہیں وردیاں
گرج رہی ہیں بدلیاں، کڑک رہی ہیں بجلیاں
ادھر سیاہ آندھیاں ادھر ہیں سرخ آندھیاں
ان آندھیوں کے درمیاں ہی درمیاں بڑھے چلو

چینی حملے کے وقت ان کی نظم "ہو کا ٹیکا" بھی رزمیہ نغمہ ہے ؎

وطن پھر تجھ کو پیمان وفا دینے کا وقت آیا
ترے ناموس پر سب کچھ لٹا دینے کا وقت آیا
نقاب سرخ کے پیچھے ہے پہلی شکل خاقانی — وہی سفاک نظریں ہیں وہی ہے چین پیشانی
وہی چنگیز کا جذبہ، وہی خواب جہاں بانی — اب ان خوابوں کو مٹی میں ملا دینے کا وقت آیا
وطن پھر تجھ کو پیمان وفا دینے کا وقت آیا

اس طرح کی کئی نظمیں ہیں ملا صاحب کے یہاں۔ لیکن اس قبیل کی نظمیں ملا صاحب کی شاعری کا ایک اہم پہلو تو ضرور ہیں مگر ان کی شاعری کی معراج اور ان کا طرۂ امتیاز نہیں۔ پھر بھی ملا صاحب کی نظموں کا مطالعہ کرتے وقت ان سے صرف نظر نہیں کر سکتے۔ ہندوستان کی آزادی کے موقع پر چھوٹے بڑے بہت سے شاعروں نے نظمیں کہیں۔ ملا صاحب کی بھی ایک خوب صورت نظم ہے جو لمحۂ آزادی کا استقبال ان الفاظ میں کرتی ہے۔ مثلاً۔

حکم معزولی بہ نام تیرگی آ ہی گیا — وادیٔ شب میں پیام روشنی آ ہی گیا
شمع رکھی جارہی ہے ہند نو کے سامنے — نظم افرنگی کا شعر آخری آ ہی گیا

(آ ہی گیا)

"سروجنی نائیڈو" کی وفات پر ان کا منظوم خراجِ عقیدت دل سے نکلی ہوئی آواز ہے ؎

چمن کا موجِ شمیم چمن سلام تجھے
گلوں کا روحِ گل دیا سمن سلام تجھے

غرورِ قومیت و دیں کے کوہساروں میں
نفاق و نسل و تمدن کے ریگ زاروں میں
الگ الگ سے حیاتِ جہاں کے دھاروں میں

ترانۂ دل گنگ و جمن سلام تجھے

ڈاکٹر ذاکر حسین کی وفات پر ان کی نظم "بوئے گم شدہ" بلا شبہ اس موضوع پر اثر انگیز نظم ہے ؎

اُٹھ گیا وہ جو تھا اک عارف کامل ساقی
مردِ درویش کا پہلو میں لیے دل ساقی

ایک ہی شمع بجھی موت کے ہاتھوں لیکن
کتنی تاریک ہوئی قوم کی منزل ساقی

اک کلی آئی تھی خوشبو، لیے کچھ دم کے لیے
وہ گئی، پھر وہی کانٹوں کی ہے محفل ساقی

دفن ہو جائے نہ خوشبو بھی کہیں پھول کے ساتھ
یہی خوشبو تو ہے اس بزم کا حاصل ساقی

ہو سکتا ہے میرا خیال غلط ہو مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح کے ٹکے بندھے اور ہنگامی موضوعات پر پختہ مشق شعرا خلوص اور عقیدت کی روشنی میں آسانی سے نظمیں کہہ لیتے ہیں (کم از کم میرا تجربہ یہی ہے) پھر ایک قابلِ غور بات اور ہے کہ ایسی نظمیں کسی شاعر کو ایک دائرہ میں محصور کر دیتی ہیں۔ اُسے زیادہ سے زیادہ وطن پرست شاعر کہا جا سکتا ہے۔ اور بعض اوقات کسی ایک سیاسی نقطۂ نظر کا ترجمان۔ مگر ملّا صاحب کا نظریہ آفاقی ہے ان کے دل میں پوری انسانیت کا درد ہے، سوز ہے تڑپ ہے اور یہی وہ جوہر ہے جو انھیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتا ہے۔ اور انھیں اس صدی کا اہم شاعر قرار دیتا ہے ــــ اس سلسلے میں خود ملّا صاحب کے نظریات کا حوالہ بے محل نہ ہوگا۔

"میرا عقیدہ تو یہی ہے کہ جس ادب میں انسانی درد کی آواز نہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ ذہنی عیاشی کے لیے سامان فراہم کر سکتا ہے، لیکن دل و دماغ کی تربیت نہیں کر سکتا۔ کلام میں تاثیر خلوص سے پیدا ہوتی ہے۔ اور عظمتِ انسانی درد کی آواز شامل کرنے سے۔ وہی شاعر ادبِ عالیہ پیش کر سکتا ہے جس میں یہ دونوں باتیں شامل ہیں۔" (میری حدیث گریزاں)

شعر کے تخلیقی عمل کے مطابق ان کا نظریہ نہ صرف واضح ہے بلکہ نئی نسل کے لیے مشعلِ راہ بھی ہے۔ فرماتے ہیں:

میرے نزدیک عظیم شاعری دراصل خارجیت اور داخلیت کو ایک ساتھ سمونے کا ریاض ہے
اور جو یہ گر جانتا ہے وہی اعلا درجے کا ادب تخلیق کر سکتا ہے۔ ایک بڑا فنکار دنیا کے واقعات
اور حادثات سے تاثر قبول کرتا ہے اور اسے اپنے ذہن اور دل میں پرورش دیتا ہے۔
اس سے کبھی لڑتا ہے، کبھی اس کو اپناتا ہے اور پھر وہ اسے اپنے جذبات اور احساس کی
تھرتھراہٹ اور اپنے تخلیقی شعور کی رفعت دے کر زبان پر لاتا ہے۔"

(میری حدیث عمر گریزاں)

میرے نزدیک تخلیقی عمل کی اس سے بہتر صراحت نہیں ہو سکتی دراصل شعری اظہار کی سطح پر رد و قبول کی جو جنگ تخلیق کار کے ذہن میں برپا ہوتی ہے اسے کچھ وہی محسوس کر سکتا ہے جو اس عمل سے گزرا ہے۔
ملّا صاحب نے اردو شاعری اس وقت شروع کی جب ان کی عمر انتیس تیس سال تھی اس اعتبار سے لکھنؤ کے بزرگانِ ادب شایدان کے ہم عصر نہیں کہلائیں گے صحیح معنوں میں ملّا صاحب کے ہم عصر تھے مجاز — وہ ان کے کافی ہاؤس کے ساتھیوں میں سے تھے مجاز کی نظم 'آوارہ' آچکی تھی اور ملّا صاحب بھی تازہ بہ تازہ نظمیں کہہ رہے تھے — مجاز کی مشہور نظم ہے 'اندھیری رات کا مسافر' — ؎

"مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں"

وہ رات کی دشواریوں کا ذکر کرتا ہے مگر اسے یقین ہے منزل پا لینے کا — ظاہر ہے مجاز کی مراد 'ایک خاص نظام' کی منزل سے تھی — مگر ملّا صاحب کی نظم 'گمراہ مسافر' انسان کے سفر کا ایسا سچا منظر نامہ پیش کرتی ہے جس میں — 'ہنوز منزل دوراست' وہ انسان اور اس کے مسائل اور اس کی مجبوریوں اور گمراہی کو غائر نظر سے دیکھتے ہیں ؎

دنیا کے اندھیرے زنداں سے انساں نے بہت چاہا نہ ملا — اس غم کی بھول بھلیاں سے باہر کا کوئی رستا نہ ملا
اہلِ طاقت اٹھتے ہی رہے بھاری بھاری تیشے لے کر — دیوار پس دیوار ملی، دیوار میں دروازہ نہ ملا

ملّا صاحب چند اشعار میں انسان کی تہذیبی حصول یابی اور ناکامی کا ذکر کرتے ہوئے آخر میں فرماتے ہیں ؎

پھر پھر کے وہیں پر آتا ہے انساں ہے رہ باطل پہ ابھی
صدیاں گزریں چلتے چلتے لیکن ہے اس منزل پہ ابھی

ملّا صاحب کی ایک اور نظم ہے — 'ارتقا' — اس نظم میں بھی ان کے فکر کا کینوس بے حد وسیع ہے۔

انسانی زندگی کے ارتقائی مراحل پران کی نظر ہے مگر وہ کوئی خواب سحر نہیں دیکھتے اور آخر میں کیونزم کے متعلق صاف لفظوں میں مجاز کی طرح ایسا کوئی مژدہ نہیں سناتے ؎

کچھ نہیں تو کم سے کم خوابِ سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک ادھر دیکھا تو ہے

اور آج کے تناظر میں تو ملّا صاحب کی یہ نظم ـــــ 'ارتقا' زیادہ حقیقت پسندانہ ہے اور ان کی بالغ نظری کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ آج اس نظم کی معنویت اور بڑھ گئی ہے۔ کچھ اشعار ؎

اہلِ دل بڑھتے رہے اور تیر چلتے ہی رہے ۔۔۔ طور جلتے ہی رہے موسیٰ نکلتے ہی رہے
زندگی دیتی رہی گو ہر نفس پیغامِ مرگ ۔۔۔ پھر بھی کچھ شوریدہ سر خوابوں پہ پلتے ہی رہے
شاخِ گل کے زخم بھرتا ہی رہا جوشِ نمو ۔۔۔ اور گلچیں توڑ کر کلیاں مسلتے ہی رہے
حرفِ آخر بن کے اترا ہر نیا آئینِ دہر ۔۔۔ پھر بھی بابِ زیست کے عنواں بدلتے ہی رہے
ارتقا کی راہ میں رکنا ہی ہے انساں کی موت ۔۔۔ ہیں وہی زندہ جو اس رستے پہ چلتے ہی رہے

مل سکی جن کو نہ اس دنیا میں جا ـــ ملّا وہ خواب
اشک بن کر دیدۂ شاعر میں ڈھلتے ہی رہے

انسانی تہذیب وتمدن کی رنگارنگی، قوموں کا عروج وزوال، نظریات کی شکست وریخت، اور بہتر سے بہتر زندگی کے لیے انسان کی جدوجہد۔ ان موضوعات کا احاطہ کرتی ہوئی ان کی ایک اہم اور قابلِ ذکر نظم ہے۔ "اور اک دن انساں جگے گا" ـــــ یہ نظم شاعر کے گہرے سماجی اور تاریخی شعور کی غماز ہے۔ انسان کی اس مسلسل جدوجہد کو انھوں نے کسی ایک ردیف قافیے یا مروجہ اصناف میں نہیں باندھا بلکہ موضوع کے اعتبار سے ہیئت کا نیا تجربہ کیا ہے۔ یہ کسی ایک ملک، کسی ایک براعظم یا کسی ایک نسل اور تہذیب کی کہانی نہیں، اور نہ تاریخ عالم کے نمایاں ناموں سے نظم کو بوجھل کیا ہے۔ یہ نظم انسان کے دل کی طرح نازک، سبک رفتار اور امید کی شمع کی طرح جھلملاتی ہوئی نظم ہے۔ نظم کے چار حصے ہیں ـــــ ابتدا اس طرح ہے ؎

کالی اندھیاری راتوں میں اک دیپ جلا اور جل کے بجھا
کچھ دیر کو قصرِ ظلمت پہ ۔۔۔ اک نور کا پرچم لہرایا
کچھ دیر کو چیر کے بادل کو ۔۔۔ ہر تہ اک تارا مسکایا

عروج کے بعد زوال کا منظر آتا ہے:

پرچم پہ اندھیرے ٹوٹ پڑے
تارے پہ گرے بادل کے پرے

دوسرے حصے میں انسانی تہذیب کے عروج کی ایک اور کیفیت ہے جو بالآخر زوال پذیر ہوتی ہے:

ویرانے میں اک پھول کھلا — کچھ دیر ہنسا، پھر مرجھایا
کچھ دم کو فضائے صحرا پر — رنگ و نکہت برسا ہی گیا
کچھ دیر کو کانٹوں کے بن میں — گلشن کا پیمبر آ ہی گیا

. . . .

لیکن آخرکار:

سنگ و آہن کی ضربوں سے امرت کا ساغر چور ہوا
ریت اپنے بگولے لے کے اٹھی اور ہر جلوہ مستور ہوا

نظم کا تیسرا حصہ انسانی زندگی کا ایک اور پہلو پیش کرتا ہے:

اک انساں زیست کی راہوں پر الفت کی مشعل لے کے بڑھا

خنجر سی نگاہیں سنگ سے دل — کچھ دم کے لیے پھر نرم ہوئے
شبنم نے بھڑکتے شعلوں پہ — کچھ دم کے لیے پھاہے رکھے

. . . .

نظم کا یہ بند بھی آخر اسی موڑ تک لے آتا ہے قاری کو:

شبنم کی ننھی بوندوں پر ہر سمت سے پھر شعلے لپکے
ذہنوں سے اٹھیں وہ جھنکاریں، دل کے سارے نغمے ڈوبے

حرص اور ہوس کے زنداں میں ابنِ آدم پھر بند ہوا
الفت کو نہ کر پایا سجدہ، طاقت کا عقیدت مند ہوا

یہ جنگ مگر جاری ہے ابھی

اور اس نظم کا آخری حصہ شاعر کا مافی الضمیر پیش کرتا ہے ــــــ اس تلخ حقیقت کا اظہار کہ آج تک شیطان

انسان پر حاوی رہا ہے۔ مگر شاعر کو یقین ہے کہ بالآخر فتح انسان کی ہوگی۔ یہ رجائیت کوئی نعرہ نہیں بلکہ اس طویل فکر انگیز نظم کا منطقی نتیجہ ہے ؎

اک دیپ جلا، آندھی نے مگر تا دیر اسے جلنے نہ دیا
اک پھول کھلا، صحرا نے مگر تا دیر اسے ہنسنے نہ دیا
اک انساں الفت لیکے بڑھا، دنیا نے مگر بڑھنے نہ دیا
اکثر تو اسے جینے نہ دیا

جب سے یہ دنیا قائم ہے
یہ جنگ برابر جاری ہے
اب تک تو یونہی ہوتا آیا انساں ہارا شیطان جیتا
لیکن جب تک یہ دنیا ہے
یہ جنگ لمبی ہوتی ہو جائے گی، میدان بدلتے جائیں گے
اور اک دن انساں جیتے گا۔

انسان جیتے گا۔ یہ ملّا صاحب کا ایمان ہے۔ اور اس یقین کی پرچھائیاں ان کی نظموں میں جگہ جگہ ملتی ہیں۔ ان کے فکر و شعور کی روشنی یاس انگیز ماحول میں امید کے دیے جلاتی ہے ؎

رات کٹتی ہی نہیں،
سحر آتی ہی نہیں،
مگر امید سی ہے کہ دلِ انساں کو
ایک دم کے لیے بھی چھوڑ کے جاتی ہی نہیں
ارتقا ہے اسی امید کا نام
اور ہنسی کی رگوں کو یہی دیتی ہے لہو
سوزِ ہر ساز یہی، خالقِ فردا ہے یہی
ہر افق کے رخِ شب تاب کا غازہ ہے یہی
دل کی دھڑکن ہے یہی، فیض کا نغمہ ہے یہی (سحر و شب)

ملّا صاحب انسانی نفسیات کی گہرائیوں میں اترتے ہیں۔ اُس کے تہہ در تہہ ذہن کی پرت پرت کھولتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ ؎

ہر انسان کے سینہ میں چھپا
اک چھوٹا بالک ہوتا ہے
اور سپنے دیکھتا رہتا ہے
انسان، مٹی، بالک، جوالا
انساں چھایا، بالک تارا
اور انگلی پکڑ اس بالک کی
جیون کے اندھیرے رستوں پر
ہر انسان چلتا رہتا ہے (سپنے)

انسان کے سینے میں چھپا یہ ننھا بالک ہی تخلیق کا سرچشمہ ہے اور عقل و شعور کی تابانی۔ اپنی ایک اور نظم میں اس بالک کا ذکر وہ نہایت دل نشیں انداز میں کرتے ہیں ؎

شاید مجھ سے دور کہیں
مجھ میں جو رہتا ہے میں
چھپ کے الگ تنہا تنہا
پھر کربِ تخلیق میں ہے
جب وہ پلٹ کر آئے گا
نئے سندیسے لائے گا
نئی شعاعیں پھوٹیں گی
اور گہن سے چھوٹ کے پھر
میں خود کو پا جاؤں گا (شعر کا جنم)

خود کو پانے کا یہ عمل اور جذبہ خود اعتمادی کی دلیل ہے۔ اس خود اعتمادی کا اظہار ملّا صاحب کی نظم و نثر میں بار بار ہوا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی ایک نمائندہ نظم ہے "ایوانِ عدالت سے رخصت ہوتے"

یہ نظم محض نظم نہیں ہے بلکہ ملا صاحب کے ایک مشہور زمانہ جرأت مندانہ فیصلہ کا "شاعرانہ دستخط" ہے ۔

یہ ہمت مردانہ پھر آئے کہ نہ آئے — مجھ سا کوئی پروانہ پھر آئے کہ نہ آئے
طاقت کی رعونت کے مقابل یہ لبِ عدل — یوں حرب حریفانہ پھر آئے کہ نہ آئے
ساقی سے سوا تشنہ لبوں سے تھا جسے انس — محفل میں وہ پیمانہ پھر آئے کہ نہ آئے
قانون کی آواز میں نغمے کی کھنک سی — یہ ساز حکیمانہ پھر آئے کہ نہ آئے
مسند پہ پہونچ کر بھی رہا حامیِ جمہور — ملا کا سا دیوانہ پھر آئے کہ نہ آئے

ملا صاحب انسان اور اس کرۂ ارض کی مٹی کے تعلق اور اس کی حقیقی محبت کو اپنی ایک نظم میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ان کے آفاقی نظریہ کی وضاحت خود بخود ہو جاتی ہے ؎

"صد شکر کہ میں چھوٹے قد کا
معمولی سا اک انسان ہوں
میں دھرتی کا
دھرتی میری
یہ مٹی میری ماتا ہے
اور میں اس کا بالک بھی ہوں، وارث بھی ہوں رکھوالا بھی۔" (بیڑیوں کا گیت)

ملا صاحب اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ انسان صرف فلسفی اور زاہدِ خشک ہو کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ زندگی کے اور تقاضے بھی ہیں حسن کا ادراک واس کے باطنی شعور کی گواہی دیتا ہے اور احساسِ جمال۔ روح کی بالیدگی سے عبارت ہے اور انسانی ذہن پر عشق کے دریچے وا کرتا ہے۔ ملا صاحب کی ایک نہایت خوبصورت نظم ہے "تم" ان کی یہ نظم میں نے اپنے لڑکپن میں پڑھی تھی اور اب تک ذہن کے گوشوں میں گونجتی ہے۔

سحر کی یاد ہو تم، اور خیالِ شام ہو تم
جو بن چکا ہے مرا جزوِ لب وہ نام ہو تم
تمھیں خیال کی رعنائیوں میں دیکھا ہے — تمھیں امید کی تنہائیوں میں دیکھا ہے
تمھیں کو روح کی گہرائیوں میں دیکھا ہے — جدھر بھی آنکھ اٹھی ہے فروغ بام ہو تم
سحر کی یاد ہو تم اور خیال شام ہو تم

اس نظم میں حسن کی رعنائیوں کے ساتھ عشق کی عظمت و رفعت کو بھی برقرار رکھا گیا ہے کیا خوب صورت اختتام ہے ؎

کسی نگاہ کا جو دل غلام ہو نہ سکا
جو سر کبھی چوکھٹ پر آج تک نہ جھکا
تمہارے در پہ وہی آج ہے جبیں فرسا
تو کیا جہان کا ملاّ سے انتقام ہو تم
سحر کی یاد ہو تم، اور خیالِ شام ہو تم

ملاّ صاحب کی نظم 'ٹھنڈی کافی' دراصل ایک افسانوی نظم ہے۔ یہ ایک لطیف تجربہ ہے . . . 'ٹھنڈی کافی' علامت ہے ایک ایسے حسن کی جس کی محبت کی گرمی کو وقت کے جھونکوں نے سرد کر دیا ہے مگر وقت بڑا ستم ظریف ہے ؎

میرے تھرماس میں تھوڑی سی ہے ٹھنڈی کافی
آؤ پی لو۔ مری خاطر سے سہی۔ اک پیالی

دعوتِ حسن کو ٹھکرانا عشق کا شیوہ نہیں چناں چہ نظم عجیب اور دلفریب تجربات سے گزرتی ہے جن کا ذکر ناگزیر ہے ؎

جو نہ کھلتی تھیں وہ کھلنے لگیں راہیں از خود
گر پڑیں فرقِ تکدر سے کلاہیں از خود
دل کی دل کے لیے اٹھنے لگیں باہیں از خود
ڈھونڈنے آئیں نگاہوں کو نگاہیں از خود
لب بہ لب مو بہ مو صدا دل کی مناجات کی تھی

ذوق و شوق، اشتیاق و اضطراب اور قربت و وصل کے لطیف جذبات سے مملو یہ نظم محبت کے ازلی اور ابدی رشتے کا خوب صورت اظہار ہے ؎

● مجھ کو اس مکر کی دنیا میں صداقت کی قسم
آدمِ پاک کے سینے کی امانت کی قسم

ایک اجڑے ہوئے فردوس کی حسرت کی قسم
زیست تھی زیست کی شایاں تو اسی رات کی تھی

'مریم ثانی' ایک اور خوب صورت اور بھرپور رومانی نظم ہے۔ یہ ایک منظوم خط کی فارم میں ہے۔ کسی کے شکایت آمیز خط کے جواب میں ـــــ تجربات کی ایک کہکشاں ہے جو اس نظم میں جلوہ فگن ہے ؎

آ گئے سامنے وہ عہدِ گزشتہ میرے
وہ میرا دورِ تبسم، وہ مرا عہدِ سخن
جب تعاون تھا لب و دل میں کھلی تھیں باہیں
دل کی ہر وادی سے جب تا بہ حدِ دیدہ ولب
قافلے شوق کے بے خوف چلے آتے تھے
اور نگاہوں کی کسی لے میں تمہاری ڈھل کر
میرے گیتوں میں بدل جاتے تھے

اور پھر یہ افسانوی نظم اس موڑ تک آتی ہے ؎

تم اتر کر نہ کبھی میری زمیں تک آئیں | میں تمہارے فلکِ پاک تلک جا نہ سکا
خوں کی ہر بوند میں فطرت کے بیانات اِدھر | عظمتِ ترکِ تمنا کی حکایات اُدھر

اس 'ترکِ تمنا' کا جو اثر عشق پر ہوا اس کا اظہار شاعر کی حقیقت پسندی اور نظریہ حیات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں نظم ایک نئی رفعتِ خیال کو چھو لیتی ہے ؎

مجھ کو یہ ضبطِ مسلسل ہی مٹا دے نہ کہیں
سانس اک رک کے نفس ہی کو جلا دے نہ کہیں
شوق بجھ بجھ کے نظر ہی کو بجھا دے نہ کہیں
خون جم جم کے رگوں کو ہی گلا دے نہ کہیں
اور یہ سوچ کے ناچار بہ صد حسرت و یاس
اپنے شانوں پہ لیے اپنی تمناؤں کی لاش

اپنی تاریکیٔ خلوت میں پلٹ آیا ہیں

حسن کے غرور اور ترکِ تعلق کے باوجود اس کی یاد شاعر کے دل میں جاں گزیں ہے۔ روح میں پیوست ہو چکی ہے جس کا اظہار وہ شکایتی خط کے جواب میں نہایت دلدوز الفاظ میں کرتا ہے۔

کٹ گئیں لمحوں میں جب صدیوں کی صدیاں اکثر

دل کی دنیا پہ اثر کچھ بھی نہیں

مجھ سے عمرِ گریزاں لے بھی چکی اپنا خراج

خاکِ دل ہو بھی چکی ریت میں کب کی تبدیل

اب کوئی گل ہے نہ غنچہ نہ کوئی برگ و بار

نہ تمنا کی گھٹا ہے نہ امیدوں کی نسیم

نہ نگاہوں میں فسانے ہیں نہ ہونٹوں پہ سرود

دل پر ہر وقت ہے۔ اک عالمِ ہو ساطاری

اک دھندلکا سا جو شب ہے نہ سحر، اور جس میں

چند ٹوٹی ہوئی قبروں کے سرہانے خاموش

یاد بیٹھی ہے، مگر پونچھ چکی ہے آنسو۔

ملا صاحب کی یہ نظم اردو کی عام عشقیہ شاعری سے ہٹ کر زندگی کے انفرادی تجربات کے رنگ و آہنگ کی کہکشاں ہے۔ اور صدیوں تک حسن و عشق کی دنیا میں گرمیٔ شوق پیدا کرتی رہے گی۔ انسان بوڑھا ہو جاتا ہے۔ اس کا لفظ بوڑھا نہیں ہوتا ـــــ اور پھر بڑھاپا جسم پر آتا ہے۔ دل پر نہیں، روح پر نہیں۔ میں اپنی اس بات کی صراحت ملا صاحب کے الفاظ سے بہتر الفاظ میں نہیں کر سکتا۔ اس لیے آخر میں ان کی وہ نظم پیش کرتا ہوں جو اپنی زبان و بیان اور ہیئت کے اعتبار سے بلا شبہ اردو کی نمائندہ نظم ہے۔ قدیم و جدید کی بحث سے ماورا ـــــ یہ نظم ملا صاحب کی عظیم شخصیت کو ایک لمحے کے لیے ایک نقطہ پر سمیٹ کر پھر عالم گیر بنا دیتی ہے ـــــ نظم کا عنوان ہے ـــــ "دنیا ہے یہ کتنی بڑی، چھوٹا ہے کتنا یہ جہاں" ۔

اتنے بڑے سنسار میں

میرا فقط اک دیس ہے

اور اس بڑے سے دیس میں
میرے لیے بس اِک نگمہ
اور اس بڑی نگری میں بھی
میرا ہے خالی ایک گھر
اور گھر کے اندر ہے مرا
چھوٹا سا اک کمرہ فقط
جس کے بس اک کونے میں ہے
بستر کسی کا اور مرا
آنسو مرے، خوشیاں مری
آہیں مری، نغمے مرے
دو بستروں کی داستاں
سارے کے سارے ہیں یہیں
اور میرے چہرے کی نقاب
آ کر اترتی ہے یہیں
دنیا ہے یہ کتنی بڑی
چھوٹا ہے کتنا یہ جہاں

ڈاکٹر اسلم پرویز

آنند نرائن مُلّا کے ساتھ ایک بالواسطہ ملاقات

ملّا صاحب کو میں ان کی شاعری اور سماجی شہرت کے تعلق سے ایک مدّت سے جانتا ہوں ۔ بیسیوں بار انھیں دیکھا ہے اور چار چھ بار ان سے ملنے کا اتفاق بھی ہو چکا ہے۔ ایک بار ان سے اس وقت قدرے تفصیلی ملاقات کا موقع بھی ملا جب میں نے ان کے گھر بر اردو گھر سے متعلق ریڈیو کے لیے ان کا ایک انٹرویو لیا تھا۔ میری ایک کمزوری یہ رہی ہے کہ جہاں دو چار بڑے آدمی جمع ہوتے ہیں میں بڑھ بڑھ کر ان کے درمیان گھسنے کے بجائے اپنے آپ کو پیچھے ہٹا لیتا ہوں اور ایسے موقعے پر کم گو ہی نہیں بلکہ بے زبان بنا بیٹھا رہتا ہوں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر بڑے لوگوں کے ساتھ کئی کئی بار بیٹھنے کا موقع ملنے کے باوجود میں اپنے وجود کا کوئی نقش اُن پر نہیں چھوڑ پاتا۔ ایسا ہی کچھ میں ملّا صاحب کے بارے میں سوچ رہا ہوں یعنی یہ کہ میں تو ان سے بخوبی واقف ہوں لیکن شاید وہ مجھے نہیں جانتے۔ پچھلے دنوں جب ملّا صاحب کو ایک حادثے کا شکار ہو کر ولنگڈن ہسپتال میں داخل ہونا پڑا تو اس خبر سے ان کے بہت سے چاہنے والوں کو تکلیف ہوئی۔ میں ملّا صاحب کے معمولاتِ زندگی اور ان کی فعال شخصیت کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا خاص طور پر ڈاکٹر خلیق انجم کے ساتھ اپنے انتہائی قریبی تعلقات کی وجہ سے۔ میرا ردّعمل اس حادثے پر جس کا ملّا صاحب شکار ہوئے تھے کچھ مختلف تھا۔ یعنی یہ کہ وہ شخص جو اس صدی کا ہم عمر ہے وہ نہ صرف یہ کہ الحمدللہ آج تک بقیدِ حیات ہے بلکہ اس کی زندگی میں حادثوں سے گزرنے کا سلسلہ بھی برابر جاری ہے۔ یہ بات میرے لیے اتنی قابلِ رشک تھی کہ اس حادثے کی خبر سن کر مجھے ملّا صاحب سے نہ تو کوئی ہمدردی ہوئی اور نہ ان پر رحم ہی آیا ہاں دل میں یہ خواہش ضرور جاگی کہ وہ جلد اچھے ہو جائیں۔ دراصل انتہائی مصروف زندگی گزارنے والے لوگ اپنے جسمانی نظام کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو بہت سے غریب اِکّے تانگے والے اپنے

ٹٹو کے ساتھ کرتے ہیں یعنی انھیں اُس ٹٹو کو بس ہر وقت جوتنے سے کام رہتا ہے۔ لیکن جب کسی نہ کسی دن یہ بات اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو وہ ٹٹو ان کے اِکّے تانگے کو لے کر پوری سواریوں کے ساتھ بیچ سڑک میں بیٹھ جاتا ہے اور باوجود بے شمار چابک کھانے کے اس وقت تک سڑک پر سے نہیں اٹھتا جب تک کہ وہ اپنی ماندگی کا وقفہ پورا نہ کرلے۔ کچھ ایسا ہی سلوک شاید ملّا صاحب نے بھی اپنی بے انتہا فعال شخصیت کے سبب اپنے جسمانی نظام کے ساتھ کر رکھا تھا۔ جس کے نتیجے میں ان کے اعضائے جسمانی نے اپنے واسطے کچھ عرصے کی لازمی چھٹی خود ہی حاصل کرلی اور اس بہانے خود ان کے اردگرد پھیلے ہوئے کام کو بھی سستانے کا موقع مل گیا۔—— کام کرنے والے لوگ جب تھکن اتارنے کے بعد چھٹی سے واپس لوٹتے ہیں تو اتنے تازہ دم دکھائی دیتے ہیں کہ انھیں دیکھ کر ان کے کام کو پسینہ آنے لگتا ہے —— خیر تو ملّا صاحب کے حادثے کی خبر سن کر میں ان کو بستر استراحت پر دیکھنے کے اشتیاق میں ڈاکٹر خلیق انجم کے ساتھ ولنگڈن ہسپتال پہنچا۔ کمرے میں بڑا آدمی صرف ایک ہی تھا وہ بھی لاچار سا بستر پر پڑا تھا ٹھیک اسی طرح جس طرح قصباتی میلے کے چلتے پھرتے چڑیا گھر میں کوئی شیر کسی ڈبّے میں بند دکھائی دیتا ہے۔ اس خلوت سے میری کچھ ہمت بڑھی اور کچھ ہی دیر میں مجھے محسوس ہونے لگا کہ ہسپتال کے کمرے کے یہ لمحے ملّا صاحب کے ساتھ انتہائی قربت میں گزر رہے ہیں۔ ملّا صاحب بڑی دیر تک میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے باتیں کرتے رہے۔ میں اور ڈاکٹر خلیق انجم ان سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ وہ ہماری کمپنی سے کافی خوش دکھائی دیتے تھے اس لیے بھی کہ ہم نے ملّا صاحب کو بقول خود ان کے "نگاہِ ترحم سے شرمسار" نہیں کیا تھا۔

اِدھر انجمن میں جب ملّا صاحب کے جشن کی تیاریوں کا سلسلہ شروع ہوا تو میرا جی چاہا کہ ملّا صاحب کے بارے میں، میں بھی کچھ لکھوں۔ ذہن پر لکھنے کے لیے زور ڈال رہا تھا لیکن کوئی سرا ہاتھ ہی نہیں آرہا تھا۔ پھر اچانک ایک روز دماغ میں بجلی سی کوندی کیوں نہ ملّا صاحب کے ساتھ بیٹھ کر کچھ بات چیت ہی کی جائے، بالواسطہ ہی سہی۔ چناں چہ اس بالواسطہ ملاقات کا منصوبہ میں نے اس طرح بنایا کہ پہلے تو میں نے کچھ سوالات قائم کیے اور پھر ملّا صاحب کی شاعری کو اور کہیں کہیں ان کی شخصیت کو بھی سامنے رکھ کر ان سوالوں کے جواب تلاش کرنے یا ترتیب دینے شروع کیے۔

آخر میں اچھا خاصا ایک انٹرویو تیار ہوگیا. جس کی خبر خود ملّا صاحب کو بھی نہیں. تصوّر کیجیے ملّا صاحب میرے سامنے تشریف فرما ہیں۔ میں ان سے کچھ باتیں پوچھ رہا ہوں اور وہ میری باتوں کا جواب ایک ایک کر کے دے رہے ہیں۔ انٹرویو بالواسطہ لیا جائے یا بلاواسطہ انٹرویو لینے والے کو اس بات کا موقع ہر وقت حاصل رہتا ہے کہ جب وہ اس انٹرویو کو قلم بند کرے تو کہیں کہیں اپنے الفاظ بھی اپنے مخاطب کے منہ ڈالتا چلے۔ اس لیے اس بات چیت سے ملّا صاحب کی جو تصویر بھی آپ کے ذہن میں بنے اسے کیمرے کی تصویر نہ سمجھیے مصور کا نقش سمجھیے اور نقش کی قسمت میں شوخیٔ تحریر کا فریادی ہونا تو لکھا ہی ہے۔

میں :۔ ملّا صاحب! کشمیری پنڈتوں کے وہ گھرانے جو خصوصاً دہلی اور یوپی میں آکر آباد ہوئے انتہائی مہذب شائستہ اور اس ہندوستانی مغل تہذیب میں رچے بسے نظر آتے ہیں جس میں اردو اور فارسی کا ستھرا مذاق بھی شامل ہے۔

مُلّا :۔ دیکھیے اگر آپ زمانہ حال کی بات چھوڑ دیں تو آپ دیکھیں گے کہ کشمیر برصغیر کا وہ خطّہ ہے جو کسی بھی قسم کے مذہبی تعصب سے بالاتر رہا ہے۔ کشمیر کے پنڈت اعلانیہ طور پر گوشت خور ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی بہت سی مذہبی رسوم میں بھی گوشت کا استعمال ہوتا ہے اس طبقے کے لوگ جب کشمیر سے اتر کر نیچے آئے تو دہلی اور لکھنؤ کی جاگیرداری تہذیب کی وضع داریاں انھیں بہت بھائیں۔ چھپ کر گوشت نہ کھا سکنے والے کشمیری پنڈتوں نے اپنی زندگی میں ریاکاری کے خلا کو پُر کرنے کی لاشعوری کوشش میں جاگیرداری تہذیب کی ان خوب صورت اور سخن ریاکاریوں کو گلے لگایا جن میں اپنی عزت آبرو کا پاس، لباس کی تہذیب، گفتگو کا وقار، لب و لہجے کی شائستگی، مجلسی آداب، رواداری، نیک سلوک سماجی پیچیدگیوں کی پوری سمجھ رکھنے کے باوجود نظریاتی الجھنوں سے خود کو بچائے رکھنے کا سلیقہ اور دانش ورانہ فکر غرض یہ تمام چیزیں شامل تھیں۔ اس تہذیب کی حیثیت ہم کشمیری پنڈتوں کی نظر میں راستِ شر انگیز کے مقابلے میں دروغِ مصلحت آمیز کی تھی جس پر ہم پوری طرح ایمان لائے۔ اسی لیے دہلی اور یوپی کے اردو بولنے اور گوشت کھانے والے مسلمانوں کو ہم کشمیری پنڈت اپنے سے زیادہ مسلمان اور کائستھوں کو اپنے سے

زیادہ کاشستہ نظر آتے ہیں۔

میں :۔ پروفیسر آلِ احمد سرور نے "جوئے شیر" کے دیباچے میں لکھا ہے کہ آنند نرائن ملاّ کی شاعری نئے لکھنؤ کی آواز ہے۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔

مُلاّ :۔ نئے لکھنؤ سے سرور صاحب کی کیا مراد ہے اس کی وضاحت تو وہ اسی دیباچے میں آگے چل کر کرچکے ہیں لیکن میرے نزدیک نئے لکھنؤ کے کیا معنی ہیں وہ میں آپ کو بتائے دیتا ہوں۔ ملحوظ رہے کہ اس بات کا جواب میں صرف اپنی ذات اور شاعری کے حوالے سے دے رہا ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس نئے لکھنؤ نے ناسخ کی اس مرصع زبان کی تقلید نہیں کی جس کی تقلید میں غالب کہاں کے کہاں پہنچ گئے، یہاں غالب کی عظمت زیر بحث نہیں ہے سب سے پہلے تو یہ ہے کہ نئے لکھنؤ کی آواز میں آپ کو زبان اور شعری موضوعات دونوں کو شامل کرنا پڑے گا۔ یہ نیا لکھنؤ اس صاف اور واضح پیرایۂ اظہار میں یقین رکھتا ہے جس کی مقبولیت داغ اور ان کے شاگردوں کے سلسلے سے ہندوستان میں چاروں طرف عام ہوئی۔ چناں چہ شاید داغ ہی کے اثر سے اقبال جیسے عظیم شاعر کے ہاں بھی تمام تر بلندیٔ فکر اور فارسی الفاظ کی کثرت استعمال کے باوجود پیرایہ اظہار صاف ہے اب آپ اگر اپنی نخوتِ ابہام میں اس شاعری کو بیانیہ کہتے ہیں تو کہتے رہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ شعر کی تہہ سے اُچھل کر کچھ آنا چاہیے اور بیانیہ میں یہ کام اور بھی مشکل یوں ہوجاتا ہے کہ وہاں شاعر قاری کے قیاس کا فائدہ اٹھانے کے لیے اپنے پیٹ میں کچھ چھپا نہیں چھوڑتا۔ جہاں تک شعری موضوعات کا تعلق ہے اسی لکھنؤ میں مجازا اور ملاّ دونوں طرح کے شاعر پیدا ہوئے۔ ایک ترقی پسندوں کی پالی کے اندر کا شاعر ہے اور دوسرا پالی کے باہر کا مگر پالی کے اندر کا شاعر ہو یا پالی کے باہر کا دونوں کا سماجی سیاق وسباق تو ایک ہی ہے۔ ایک سچے شاعر کے لیے سماجی سیاق وسباق سے جڑا رہنا پہلی شرط ہے اب اس سیاق وسباق کے ساتھ اپنی وابستگی کے اظہار کی کتنی سکت یا جرأت اس کے اندر ہے یہ اس سے آگے کی بات ہے۔

میں :۔ آپ انسان دوست ہیں، انسانیت کے علمبردار ہیں۔ میں آپ سے یہ جاننا چاہوں گا

کہ انسان کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں۔

مُلاّ :۔ میں انسان کو مرکزِ کائنات سمجھتا ہوں۔ یہ نظامِ کائنات اپنی تمام تر ہیئت اور عظمت کے باوجود بے حس اور بے زبان ہے۔ انسان ہی نظامِ کائنات کی زبان بھی ہے اور حس بھی۔ اور جب میں آپ سے انسان کی بات کر رہا ہوں تو اس میں انسان کے تمام ہی متنوع اور متضاد روپ شامل ہیں اس لیے میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ میں کسے سینے سے لگاؤں اور کسے مردود قرار دوں۔ اور جب تک مجھ پر کائنات کی اصل اور تمام تر حقیقت منکشف نہیں ہو جاتی، خدا جانے وہ دن کبھی آئے گا بھی یا نہیں، میں کائنات کی اصل حقیقت انسان ہی کو سمجھتا رہوں گا۔ انسان کے سارے روپ میرے اپنے روپ ہیں۔ انسان کا ہر دین اور انسان کی لادینی میرا دین اور میری لادینی ہے۔

میں :۔ گناہ کے بارے میں آپ کا کیا نظریہ ہے۔

مُلاّ :۔ جو فرق وہم اور حقیقت میں ہے وہی میرے نزدیک عبادت اور عصیاں میں ہے عقیدہ گھپ اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر، بچ بچا کر، اپنے تلے قدموں کے ساتھ، بغیر کسی چیز سے ٹکرائے یا ٹھوکر کھائے آگے بڑھنے یا کسی سمت کے تعین کے احساس کے بغیر صرف ٹامک ٹوئیاں مارنے کا نام ہے جس میں شاید کہیں بہت دور تک اور بالکل سیدھے چلتے چلے جانے کا امکان کم ہی ہے۔ اس کے برعکس گناہ نام ہے ایک خود اعتمادی اور خود اختیاری کا گناہ کے جہاں میں نصف النہار کا سا سما ہوتا ہے جہاں ہر چیز روشن اور صاف ہوتی ہے۔ ایسے میں دانستہ ٹھوکر کھانے میں جو لطف آتا ہے اس کی بات ہی کچھ اور ہے۔ عقیدے کا دائرہ جتنا تنگ ہوتا ہے گناہ کے حدود اربعا اتنے ہی لامتناہی ہوتے ہیں۔ گناہ کی بارگاہ میں کوئی سجدہ نامقبول نہیں ہوتا ہے۔ جہاں جستجو گناہ ہو، گفتگو جرم ہو، جرات پہ تعزیریں ہوں، اظہار پہ پہرے ہوں، حسن پر مخرب اخلاق ہونے کی فردِ جرم عائد ہو۔ جہاں میرے دوش پر خود میری خطا کے بار کے علاوہ اور کوئی بار نہ ہو وہ فضا مجھے کائنات کی وسعتوں سے بھی زیادہ کھلی لگتی ہے اس فضا میں میرا دیر تک سانس لینے کو جی چاہتا ہے، اجزائے عناصر کے پریشاں ہونے تک۔

میں :۔ ملّا صاحب آپ اپنی گفتگو میں خاصے رومانی ہوتے جا رہے ہیں۔

مُلّا :۔ ہاں! شاید اسی لیے کہ شاعری میں نہیں ہو سکا۔ ہمیشہ صاف اور دو ٹوک باتیں کرتا رہا جسے آپ کے زمانے کی بقراطی تنقید سپاٹ بھی کہہ سکتی ہے۔

میں :۔ آپ کا تعلق نئے لکھنؤ سے ہے۔ میرا کہنا یہ ہے کہ پرانے لکھنؤ میں تو معاملہ بندی کی شاعری بہت ہوئی۔ آپ کے کلام کے مطالعے سے کہیں کہیں ایسا پتا چلتا ہے کہ طبیعت آپ کی بھی کافی رنگین رہی ہے۔ میرا اشارہ آپ کی بعض طویل عشقیہ نظموں کی جانب ہے۔

مُلّا دیکھیے پرانے لکھنؤ کی شاعری میں نچلی قسم کی معاملہ بندی کا رواج تھا۔ دہلی میں مومن جیسے شاعروں کے ہاں انفرادی معاملات کا ذکر زیادہ بھی اور مہذب انداز میں ملتا ہے جہاں تک میرے معاملات عشق و عاشقی کا تعلق ہے ان میں نہ تو وہ بازاری پن ہے کہ مجھے یہ کہنا پڑے کہ:

کود ایوں تمہارے گھر میں کوئی دھم سے نہ ہوگا

اور نہ میرے ہاں جاگیر داری گھرانوں کے اس چوری چھپے عشق والا معاملہ ہے جس کے بارے میں مجھے یہ خوف لاحق ہو کہ:

زندگی پردہ در نہ ہو جائے

یہ صحت مند اور بے ریا عشق کی وہ سیدھی سچی نظمیں ہیں جو طویل اس لیے ہیں تاکہ خوش ذائقہ یادوں کا چسکا میں دیر تک لے سکوں۔ ان نظموں کا معاملہ down memory lane کا سا ہے۔

میں :۔ کیا آپ یہاں زندگی کی کسی حسین واردات کا ذکر کرنا پسند کریں گے۔

مُلّا اب اس عمر میں ان وارداتوں کو دہرانا 'ٹھنڈی کافی' کے پیالے پر گرم گفتگو کرنے کے مترادف ہوگا۔

میں :۔ آج کی نوجوان نسل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بالکل گمراہ، بے راہ رو اور اپنی قدروں سے بے گانہ محض ہے۔ کیا آپ بھی ایسا ہی سوچتے ہیں؟

مُلّا ہم جب تک قدروں کے خزانے پر سانپ بنے بیٹھے رہیں گے اور انھیں نئی نسل

ہیں اس طرح تقسیم کریں گے جیسے کنجوس خیرات دیتا ہے تو پھر نتیجہ تو یہی ہونا ہے۔ آپ تو نئی نسل کی بات کر رہے ہیں آپ نے یہ تماشا بھی تو دیکھا ہے کہ جب آپ نے شاعری کو قدامت کے جوئے کے نیچے سے نکلنے سے روکا تو کچھ دنوں کے لیے آپ کی شاعری تک اپہج ہو گئی تھی اور یہ لنگ اس میں تھوڑی بہت اب بھی ہے۔ لیکن اس کے لیے ذمے دار کون ہے چاہے شاعری ہو یا سماج جب تک آپ مستقبل کا کوئی لائحہ عمل تیار کر کے نہیں رکھیں گے تو نتیجہ افراتفری کے علاوہ اور کیا ہونا ہے۔

میں: آزاد ہندوستان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔

مُلاّ: سماجی انصاف کی لڑائی حکومتیں بدلنے سے نہیں ختم ہو جاتی اگر ایسا ہو سکتا تو کسی بھی ملک کے آزاد ہونے کے بعد اس کے عدالتی نظام کو بھی تہہ کر کے رکھ دیا جاتا۔ پیروں کی بیڑیاں ہر آدمی کاٹ کر پھینک دینا چاہتا ہے لیکن گردن کی طلائی زنجیر کوئی نکال کر پھینکنے کو تیار نہیں اور پھر ایک آزاد ملک میں انسان کو روٹی کپڑا مکان ہی نہیں اپنی تہذیب اپنی زبان بھی تو چاہیے ہوتی ہے روٹی کپڑے مکان کی ضمانت ہر ہندوستانی کو آج آزادی ملنے کی تقریباً نصف صدی کے بعد بھی حاصل نہیں ہو سکی لیکن زبان اور تہذیب پر تو آزاد ہوتے ہی راتوں رات ڈاکا پڑ گیا۔

میں: بس آخر میں ایک سوال اور دریافت کرنا ہے۔ ہماری شاعری میں نظیر اکبرآبادی اور پھر ان کے بعد انجمن پنجاب سے لے کر آج تک نظم کی ایک توانا روایت موجود تھی پھر بھلا آپ غزل کو شبستاں سے میدان میں کیوں کھینچ لائے۔

مُلاّ: آپ جانتے ہیں میں نے نظمیں بھی کافی کہی ہیں پھر بھی اتنی نہیں جتنی غزلیں کہیں ہیں دراصل آپ خود ہی کہہ چکے ہیں میری تمام تر غیر رسمی اور غیر روایتی فکر کے باوجود میری شخصیت کی اصل شناخت میری جاگیردارانہ شائستگی ہے آپ اس جاگیردارانہ شائستگی کو ایک مستحسن تہذیبی ریاکاری کا نام دیتے ہیں اور آپ کی اسی بات میں سے مجھے آپ کی بات کا جواب تلاش کرنے میں مدد مل رہی ہے۔ معاملہ یہ ہے کہ غزل بڑی ریاکار صنف ہے کہنا کچھ چاہتی ہے کہتی کچھ ہے۔ اب آپ ہی بتلائیے سیاسی،

مذہبی اورمعاشرتی غلامی کی اس آزاد دنیا میں اگر ملاّ غزل کی ریاکاری کے پردے میں اپنی بات نہ کہتا تو کیا لوگ اسے زندہ چھوڑتے۔ دراصل میں نے اکثر غیر متنازع باتیں نظم میں اور بیشتر متنازع باتیں غزل کی زبان میں بیان کی ہیں۔ جو شخص پیشے کے اعتبار سے حاکم وقت کا وکیل ہو اس کے اندر کا شاعر تو غزل کی یہی زبان استعمال کرسکتا ہے نا:

وہ دادِ دستِ دل نہ وہ بزم نہ وہ رند
انساں کی جگہ آج ہے وردی میں سپاہی

ملا صاحب کے ساتھ اس طویل گفتگو کا ایک مقصد ان سے ذہنی قربت حاصل کرنا بھی تھا جو میری حد تک تو پورا ہو ہی گیا ہے۔

ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ

پنڈت آنند نرائن مُلّا کے نثری افکار

پنڈت آنند نراین ملّا اردو کے ان بزرگ ترین ادیبوں میں ہیں جنھوں نے شعر کو اپنے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ وہ اردو ادب میں بہ حیثیت شاعر ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ گزشتہ نصف صدی کے دوران انھوں نے اردو کے شعری سرمایے میں جو گراں قدر اضافے کیے ہیں، ان کی وجہ سے اردو ادب کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ لیکن وہ اگر "جوئے شیر" نہ لکھتے اور "میری حدیثِ عمر گریزاں" تخلیق نہ کرتے تب بھی ان کا یہ جملہ کہ "میں مذہب چھوڑ سکتا ہوں لیکن زبان نہیں چھوڑ سکتا" انھیں اردو دنیا میں حیاتِ دوام بخشنے کے لیے کافی تھا۔ تقریباً ربع صدی گزر جانے کے بعد بھی ان کا یہ جملہ زبان زدِ خاص و عام ہے۔ ملّا صاحب یہی بات اگر شعر میں کہتے تو سمجھا جاتا کہ وہ غلو یا حُسنِ بیان سے کام لے رہے ہیں۔ بہت سے اہلِ نظر اسے خود کلامی پر محمول کرتے۔ ممکن ہے بعض ناقدانِ شعر اسے محض داخلی اور تاثراتی اظہار کا نام دے کر اس سے صرفِ نظر کر جاتے، لیکن نثر کے پیرایے میں کہی گئی بہ ظاہر یہ سادہ سی بات بہتوں کے دلوں کو چھو گئی۔ یہ ایک ایسی فکر تھی جس نے کتنوں کو چونکا دیا، اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ کیا واقعی زبان کو عقیدے پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ ایک مخصوص طرزِ فکر رکھنے والے طبقے کو ملّا صاحب کے اس بیان سے اتفاق نہ ہو اور وہ عقیدے ہی کو سب کچھ سمجھتا ہو، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ملّا صاحب کا یہ بیان اردو زبان سے ان کی گہری عقیدت، سچّی محبت اور والہانہ لگاؤ کا غماز ہے۔ ملّا صاحب کو اردو سے بے پناہ عشق ہے۔ وہ اردو کو ٹوٹ کر چاہنے والوں میں ہیں خواہ اس کے لیے انھیں مذہب اور عقیدے کو ہی کیوں نہ قربان کر دینا پڑے۔

مجھے ملّا صاحب کی اس ندرتِ فکر نے اس حد تک متاثر کیا کہ میں ان کی شخصیت، مزاج اور فکر کا

بہت قریب سے مطالعہ کرنے کے لیے بے چین ہو گیا۔ اگرچہ ملاّ صاحب کی شخصیت کی جھلک اور ان کے مزاج اور فکر کی عکاسی ان کی شاعری میں پائی جاتی ہے لیکن شاعری طبعاً تخلیقی ہونے کی وجہ سے بیش تر داخلی کیفیات اور جمالیاتی تجربات تک محدود رہتی ہے اور خارجی دنیا کے معاملات سے اس کا سا تھ بہت کم رہتا ہے۔ خارجی عِلَل و عوامل کو سمجھنے کا نثر بہترین ذریعہ ہوتی ہے۔ ملاّ صاحب ایک کامیاب شاعر ہونے کے علاوہ ایک جہاں دیدہ انسان اور دانشور بھی ہیں۔ انھوں نے اپنے بعض خیالات کی ترویج کے لیے نثر کا سہارا لیا ہے۔ ملاّ صاحب کا نثری سرمایہ بہت قلیل ہے جو چند مضامین، خطبات اور ریڈیائی تقاریر پر مشتمل ہے۔ لیکن ان میں گہری لسانی فکر، دانشورانہ سوجھ بوجھ اور سماجی و تہذیبی شعور کی جھلک پائی جاتی ہے۔ بعض مضامین میں گہری تنقیدی بصیرت بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔

ملاّ صاحب کی نثرنگاری کا آغاز ایک ریڈیائی ٹاک سے ہوتا ہے جس کے محرک نیازؔ فتحپوری تھے۔ اس ٹاک کا عنوان تھا "غالبؔ کے کلام میں تصوف" اور یہ ۱۹۳۸ء میں آل انڈیا ریڈیو، دہلی سے نشر ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے ان کی ریڈیائی ٹاکس کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور ۱۹۷۵ء تک بقول ملاّ صاحب ان کی ڈھائی تین سو ٹاکس نشر ہوئیں۔ لیکن افسوس کہ ان میں سے بیشتر ٹاکس ضائع ہو گئیں اور جو محفوظ رہ گئیں وہ ان کے مجموعے "کچھ نثر میں بھی" میں شامل ہیں۔ لیکن ان کی تعداد صرف دس ہے ریڈیائی ٹاکس کے بعد ملاّ صاحب کے خطبات کا نمبر آتا ہے۔ جن دہلی یونیورسٹی کے نظام خطبات، انجمن ترقی اردو (ہند) کی اردو کانفرنس اور جامعہ اردو، علی گڑھ کے جلسۂ تقسیم اسناد کے صدارتی خطبات کو بےحد اہمیت حاصل ہے۔ ملاّ صاحب کی ریڈیائی ٹاکس ہوں یا ان کے خطبات و مضامین، یہ زیادہ تر قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں۔ کیوں کہ پیشہ ورانہ مصروفیات کی وجہ سے ملاّ صاحب کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا تھا کہ وہ پہلے سے انھیں لکھتے، صاف کرتے، ان پر نظرثانی کرتے یا ان کی نقول تیار کرتے۔ ملاّ صاحب بنیادی طور پر ایک شاعر ہیں۔ اپنے مخصوص شعری مزاج یا محض عدیم الفرصتی کی بنا پر انھوں نے نثر کی طرف وہ توجہ نہیں دی جس کی وہ متقاضی تھی۔ انھیں خود بھی اس کا اعتراف ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> "دراصل میں نے نثرنگاری کی طرف کبھی کوئی توجہ نہیں کی۔ شاید غیرشعوری طور پر میں نے یہ محسوس کیا کہ جیسے یہ صلاحیت مجھ میں نہیں۔ شاعری میں تو روایات کی بیساکھی مل جاتی ہے، آہنگ کے سہارے کام آتے ہیں۔

لیکن نثر لکھنے والے کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا پڑتا ہے اور ساری مسافت
اپنے ہی بل بوتے پر طے کرنا پڑتی ہے۔ نثر نگاری (سطحی افسانہ نویسی اور
انشائے لطیف کی اور بات ہے) اچھی خاصی علمی واقفیت چاہتی ہے۔"

ملّا صاحب کے نثری افکار کو تین زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (۱) دانشورانہ افکار، (۲) انتقادی افکار اور (۳) لسانی افکار۔ دہلی یونیورسٹی کے نظام خطبات ملّا صاحب کے دانشورانہ افکار کی بہترین مثال پیش کرتے ہیں۔ ان خطبات کے مطالعے سے ملّا صاحب کی اپنی فکر کا پتا چلتا ہے۔ وہ کسی موضوع پر اظہارِ خیال کے لیے موٹی موٹی کتابوں کی "چھان بین" اور "وسیع مطالعے" کی ضرورت پر زیادہ زور نہیں دیتے اور نہ اس کے لیے وہ "علم کی گہرائیوں میں ڈوبنے" کے قائل ہیں بلکہ وہ اپنے "احساس اور شعور کی تربیت" سے ایک اپنا اندازِ فکر پیدا کرتے ہیں جو لوگوں کو متاثر کرتا ہے۔ ملّا صاحب ایک جگہ فرماتے ہیں:

"میں وسیع مطالعے کا قائل ضرور ہوں لیکن اس سے کہیں زیادہ
اس بات کا قائل ہوں کہ انسان خود ان موضوعات پر سوچے اور غور کرے
جن کے بارے میں وہ دوسروں کے ذہن سے فائدہ حاصل کرنا
چاہتا ہے۔"

دہلی یونیورسٹی کے نظام خطبات کے تحت "عالمی نظام میں انسان کے بنیادی حقوق" کے موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے انھوں نے اپنی جس عمیق فکر کا ثبوت دیا ہے اس سے نہ صرف موضوع پر ان کی مضبوط گرفت کا پتا چلتا ہے بلکہ دنیا کی تاریخ و تہذیب اور سیاسی نظام کی طرف ان کے دانشورانہ رویے کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور آزادی، مساوات اور اخوت کے بارے میں ان کی اپنی رائے کا بھی پتا چلتا ہے۔ اس ضمن میں ان کا یہ فکر پارہ ملاحظہ ہو:

واقعہ یہ ہے کہ انسان نے جینا تو پیدائش کے روز ہی سیکھ لیا تھا،
کیوں کہ جہدِ بقا اس کی فطرت کا تقاضا تھا، لیکن دوسروں کو جینے دینے
کا گُر وہ آج تک نہ سیکھ سکا۔ اور زندگی کے سارے غم اور پریشانیاں،
سارے جبر اور خوں ریزیاں، ساری محرومیاں اور ناانصافیاں اسی کوتاہی

کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔"

آج جب کہ تخریبی قوتیں ہر طرف اپنا سر اٹھارہی ہیں اور تعمیری قوتوں کو پنپنے سے روک رہی ہیں ملا صاحب کا ذیل کا اقتباس کتنا معنی خیز بن جاتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ ان کی نثر کا ایک خوب صورت نمونہ بھی ہے، ملاحظہ ہو:

> تعمیری اور تخریبی قوتیں ایک ہی انداز سے اپنا کام نہیں کرتیں۔ بجلی، زلزلے، آندھی، طوفان ایک مہیب شور اور گرج لے کر آتے ہیں لیکن بنیادی طور پر یہ وقتی ہوتے ہیں۔ زندگی با وجود ان کی لائی ہوئی آفات کے آگے بڑھتی ہے اور یہ تعمیری قوتوں سے شکست کھا کر غائب ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے تعمیری قوتیں اتنی خاموشی سے کام کرتی ہیں کہ لوگوں کی نظر کافی دیر تک ان کی طرف نہیں جاتی۔ رات کس طرح دن بن جاتی ہے موسم کس طرح بدل جاتا ہے، کلی کس طرح پھول بن جاتی ہے، فضا کی نمی کس طرح شبنم کا قطرہ بن کر پھول کی پنکھڑی پر ستارہ جڑ دیتی ہے۔ یہ باتیں بجلی اور طوفان سے کہیں زیادہ اہم اور دیرپا ہیں۔"

اس قسم کے نمونے ان کی نثر میں جابجا پائے جاتے ہیں۔

ملا صاحب کے نثری افکار میں ان کے انتقادی افکار کو بھی بے حد اہمیت حاصل ہے۔ ملا صاحب اگرچہ پیشہ ور نقاد نہیں، لیکن غالب، سرشار، چکبست، اثر و سراج نیز سردار جعفری کے مجموعۂ کلام "پیراہنِ شرر" پر ان کی جو تحریریں ملتی ہیں۔ ان سے ان کی تنقیدی بصیرت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ملا صاحب کی تنقیدی تحریروں کو تاثراتی تنقید کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ کسی فن پارے کو پڑھ کر جو تاثرات وہ اپنے ذہن پر مرتسم کرتے ہیں اور بعدہٗ قاری تک منتقل کرتے ہیں اس میں ان کے وجدان کو کافی دخل ہوتا ہے۔ اگر ملا صاحب کی تنقیدی تحریروں کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ ان کے جذباتی ردِ عمل کا نتیجہ ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ ملا صاحب کے تنقیدی رویے کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ وہ محض فن پارے کی تحسین سے کام نہیں لیتے بلکہ اس کی خامیوں کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔ یہاں صرف ایک اقتباس نقل کرنا کافی ہوگا۔ سرشار کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"لیکن فنی اعتبار سے "فسانۂ آزاد" میں بے شمار خامیاں ہیں۔ افسانے کا نہ تو
قصہ ہی کوئی خاص دلکش ہے اور نہ اس میں وہ سلسلہ اور ربط ہے جو
ایک افسانے کے لیے لازمی ہے۔ بہت سے باب ایسے ہیں جن میں محض
فضول اور غیر متعلق باتوں کا ذکر ہے۔ کردار نگاری میں بھی نفسیات کے
اعتبار سے سنگین خامیاں ہیں۔ سرشار نہ تو مفکر تھے اور نہ ماہر نفسیات۔
انھوں نے انسان کے دل و دماغ کا گہرا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ
وہ اپنی شوخی اور ظرافت سے روتوں کو تو ہنسا لیتے تھے لیکن نرم دل سے
نرم دل کو بھی رُلا نہ سکتے تھے۔ ان کے افسانوں میں درد PATHOS
بالکل معدوم ہے۔"

ملّا صاحب کی نثری تحریروں کا ایک خاص عنصر ان کی لسانی فکر ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ان کے
لسانی افکار کو ان کے دوسرے تمام نثری افکار پر اولیت حاصل ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ اردو سے ان کے
والہانہ عشق کا ذکر شروع میں آچکا ہے، اور یہ بھی بیان کیا جاچکا ہے کہ ملّا صاحب کے لیے زبان مذہب
سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ آج سے ۲۰ سال قبل انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیرِ اہتمام منعقدہ اردو
کانفرنس کے اجلاس میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے انھوں نے بڑی جرأت کے ساتھ یہ اعلان کیا تھا کہ
"میں مذہب چھوڑ سکتا ہوں لیکن زبان نہیں چھوڑ سکتا۔" ان کے اس اعلان نے اردو تحریک میں ایک
نئی روح پھونک دی تھی اور محبانِ اردو کے دلوں میں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا کر دیا تھا۔

اردو کے بارے میں ملّا صاحب کا موقف بالکل واضح ہے۔ وہ اردو کو اِسی ملک کی زبان سمجھتے
ہیں "جو تقسیم ہند کے بعد بھی کروڑوں شہریوں کی مادری زبان ہے۔" ان کے نزدیک اردو قومی یکجہتی کا
ایک نشان اور باہمی میل جول کا ایک عظیم نمونہ ہے۔ ملّا صاحب کی مادری زبان اردو ہے۔ وہ اردو لکھنا
پڑھنا اور بولنا اپنا آئینی حق سمجھتے ہیں۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے:

اردو کا سوال میرے لیے اپنی مادری زبان کا سوال ہے۔ جب تک
اس دیس میں جمہوری حکومت قائم ہے اور میری دعا ہے کہ روز بروز
یہ اور مضبوط ہو اس وقت تک مجھے آئین نے کچھ بنیادی حقوق دیے ہیں

اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ میں اپنی مادری زبان پڑھوں، لکھوں اور
بولوں اور اسی زبان میں اپنے جذبات اور افکار کو پیش کروں۔"

ملا صاحب نے مادری زبان کی اہمیت پر بہت زور دیا ہے۔ ان کے خیال میں "انسان اپنی مادری زبان ہی میں اپنے دل و دماغ کی نقاب کشائی تخلیقی حسن کے ساتھ صحیح اور پورے طور پر کر سکتا ہے . . . کوئی انسان جس سے اس کی مادری زبان چھین لی جائے وہ اپنا پورا قد نہیں پاتا اور وہ اس پودے کی مانند ہوتا ہے۔ جو ناسازگار آب و ہوا کی وجہ سے ٹھٹھر کر رہ جائے۔" ان کے نزدیک مادری زبان محض ایک زبان ہی نہیں ہوتی۔ یہ صدیوں کی تاریخ، تہذیب، معاشرت اور انداز فکر کا ملا جلا نتیجہ ہوتی ہے۔" اور جہاں تک اردو کا تعلق ہے، یہ ملا صاحب کی ذات کا آئینہ ہے ان کی میراث ہے، ان کی تاریخ ہے اور ان کی زندگی ہے۔

ملا صاحب کی لسانی فکر کے تجزیے سے پتا چلتا ہے کہ وہ اردو تحریک کے ایک فعال قلم کار ہی نہیں بلکہ ایک نڈر سپاہی بھی ہیں۔ ملا صاحب نے ہر جگہ اور ہر موقع پر اردو کی وکالت بڑی بے باکی کے ساتھ کی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں انھوں نے جہاں حکومت کے جبر اور عوام کے تعصب کا ذکر کیا ہے وہیں حامیانِ اردو کے خونِ جگر کی کمی کا بھی شکوہ کیا ہے۔

ملا صاحب نے ایک طویل عرصے تک اردو تحریک کی علم برداری کی ہے۔ وہ انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر رہے۔ انجمن کی اتر پردیش کی ریاستی شاخ کے بھی صدر رہے۔ جامعہ اردو علی گڑھ کے نائب امیر جامعہ رہے۔ ان کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ اردو کو اس کے جائز حقوق مل جائیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے تین قسم کے محاذ کے قیام پر زور دیا ہے۔ یعنی عوامی محاذ، تنظیمی محاذ اور آئینی محاذ۔ عوامی محاذ کا مقصد عوام کو محبانِ اردو کے نظریے کی صحت اور ان کی حق تلفی کی اہمیت کا احساس دلانا تھا نیز اردو کے بارے میں جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں یا جو جان بوجھ کر پھیلائی جا رہی تھیں ان کی تردید کرنا تھا۔ اردو کے حقوق کے مطالبے کے لیے ملا صاحب نے تنظیمی محاذ کے قیام پر شدت کے ساتھ زور دیا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ محبانِ اردو کو جوش اور جذبات سے کام لینے کے بجائے ایک منظم تحریک کی شکل میں اردو کے حقوق کا مطالبہ کرنا چاہیے۔ آئینی محاذ کے قیام کا مقصد مرکزی حکومت نیز ریاستی حکومتوں کی توجہ اپنے بنیادی حقوق کی پامالی کی طرف برابر دلاتے رہنا تھا۔ ملا صاحب نے آج سے

۳۰ سال قبل جن تین محاذوں کے قیام کی اہمیت پر زور دیا تھا ان کی ضرورت آج بھی ہے کیوں کہ اردو کے مسائل جہاں تھے وہیں ہیں، بلکہ پہلے سے بھی زیادہ پیچیدہ ہو گئے ہیں۔ آج تعلیمی اداروں سے اردو رخصت ہوتی جا رہی ہے اور نئی نسل اردو سے بالکل نابلد ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ آج اردو کے لیے ایک اور محاذ کھولا جائے اور وہ تعلیمی محاذ ہو۔ ملّا صاحب نے تعلیمی سطح پر اردو کے نفاذ کی دشواریوں کو بہت پہلے بھانپ لیا تھا۔ انھوں نے اکتوبر ۱۹۶۳ء میں ریاستی سہ لسانی کنونشن اتر پردیش کے انعقاد کے موقع پر اپنی صدارتی تقریر میں اردو کے ساتھ حکومت اتر پردیش کے غیر منصفانہ رویے کی سخت تنقید کی تھی اور بہ بانگ دہل پر اعلان کیا تھا کہ "سہ لسانی فارمولے میں جو تیسری زبان انتخاب کرنے کا طریقہ رکھا گیا ہے وہ اردو کے لیے سم قاتل سے کم نہیں۔"

۱۹۶۱ء میں جب تمام ریاستوں کے وزرائے اعلا اور مرکزی حکومت کے وزیر کی میٹنگ میں طلبہ کو تین زبانیں پڑھانے کا فیصلہ ہوا تھا تو ملّا صاحب نے اس فارمولے کا دل سے خیر مقدم کیا تھا کیوں کہ ہر اس طالب علم کو جس کی مادری زبان اردو تھی یا جو اردو پڑھنا پسند کرتا تھا یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ اردو بحیثیت تیسری زبان کے پڑھے۔ لیکن اتر پردیش کی حکومت نے سہ لسانی فارمولے کے الفاظ کے کھلے مفہوم کے خلاف جو تاویل پیش کی تھی اس سے ملّا صاحب کو سخت تکلیف پہنچی تھی اور وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ "ہماری ریاستی حکومت نہ آئین کی پروا کرتی ہے اور نہ انصاف کی اور لسانی تعصب کا شکار ہو چکی ہے۔" حکومت اتر پردیش نے سہ لسانی فارمولا کی دفعہ (ب) کے تحت کی زبانوں میں سنسکرت کو شامل کر کے اردو کے ساتھ سخت ناانصافی کی تھی۔ ملّا صاحب کے خیال میں سنسکرت چوں کہ ایک کلاسیکی زبان ہے اس لیے ملک کی دوسری زندہ زبانوں میں سنسکرت کا شمار کرنا اصولاً غلط تھا۔ اور یہ محض اس لیے کیا گیا تھا کہ "اسکول کے حکام کو اردو نہ پڑھانے کا ایک نو بہانہ مل جائے۔"

ملّا صاحب کی لسانی تحریروں کے تجزیے سے پتا چلتا ہے کہ لسانی مسائل پر ان کی نظر بہت گہری تھی اور وہ دو ٹوک بات کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتے تھے خواہ وہ حاکم وقت کے بارے میں ہی کیوں نہ ہو۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ملّا صاحب نے گزشتہ نصف صدی کے دوران جس جرأت و بے باکی اور جس مجاہدانہ عزم کے ساتھ اردو کی لڑائی لڑی ہے اس کی مثال اردو تحریک کی تاریخ میں بہت کم ملے گی۔

احمد سعید

ملّا صاحب
اپنی شاعری کے آئینہ میں

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تاز بزم عشق یک دانای راز آید برون (اقبالؔ)

اقبال نے اپنے اس شعر میں جس "دانای راز" کی طرف اشارہ کیا ہے وہ کعبہ و بت خانہ میں ایک عمر نہیں بلکہ "عمرہا" کی عبادت و ریاضت اور نالہ و تضرع کے بعد عشق کی اس منزل پر پہنچ بھی سکتا ہے اور شاید نہیں بھی جہاں وہ "دانای راز" ہونے کا دعوا کر سکے لیکن ملّا صاحب نے "میری حدیث عمر گریزاں" کے دیباچہ میں جس "دانای راز" کی بات کہی ہے اور اس کے لیے ایک خاص محک و میزان مقرر کرتے ہوئے جس راہ کی نشاندہی کی ہے وہ راہ "عشق الٰہی نہیں بلکہ عشق عبادالٰہی" ہے۔

نوع انسان کے لیے ایک دردمند شاعر کا جذبہ اخلاص، انسانی اقدار اور انسانی عظمت کے تئیں اس کا مثبت اندازِ فکر، انسانی مسائل کی نسبت اس کی حسّ آگہی اور پھر "کرب آگہی" بھی، اگر آج کے شعراء میں "دانای راز" تک پہنچنے کے لیے ان صفات کو ہم اپنی مقیاس مقرر کرتے ہیں تو یقیناً دانایان راز کی ایک مختصر سی صف میں اپنے ملا صاحب خاصے اونچے قد کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں۔ ملّا صاحب کے یہاں انسانیت کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہے انسانیت ہی ان کا مسلک ہے اور وہی ان کا مذہب جس پر وہ ہمیشہ اور ہر حالت میں پورے عزم، ایمان اور جذبیت کے ساتھ قائم ہیں۔ انسان دوستی ہی ان کا نظریہ حیات ہے جو ان کی شاعری میں ایک عظیم مقصد کی شکل میں جگہ جگہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس راہ میں انھیں دیر و حرم کی عظمت سے بھی انکار نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ دیر و حرم ان کے درد کا مداوا کبھی نہ بن سکے۔ ان کے لیے "دیر و حرم سے دور ہے محویتِ نیازِ عشق" انھوں نے اپنی منزل کی تلاش میں جب جب بھی دیر و حرم کا دروازہ کھٹکھٹایا ہے اپنے کو اجنبی چہروں کے درمیان تنہا کھڑے پایا ہے۔ اس حال میں

"خدائے دیر و حرم" کے حضور میں ان کی یہ جھنجلاہٹ بے محل نہیں۔

ہماری جا بھی کہیں ہے خدائے دیر و حرم
حرم میں غیر ہیں اور بتکدے میں بیگانے

اور شاید یہی جھنجلاہٹ، اسی کرب کے ساتھ اور بالکل اسی انداز میں علامہ اقبال کی اک رباعی میں ملتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

رہ و رسم حرم نامحرمانہ | کلیسا کی ادا سوداگرانہ
تبرک ہے مرا پیراہن چاک | نہیں اہل جنوں کا یہ زمانہ

دیر و حرم کی مشعلیں انھیں ان کی منزل کا سراغ نہ دے سکیں۔ دھوئیں کے بادل کچھ اور گھرے ہوتے چلے گئے۔ جوں جوں سر کھپایا اندھیرے بڑھتے رہے، چیزیں اور دھندلی ہوتی چلی گئیں۔ بقول میرزا عبدالقادر بیدل:

درین حیرت سرا عرفان ماہم عالمی دارد
سراپا مغز دانش گشتن و چیزی نہ فہمیدن

اور اسی درد کو لے کر خود ملا صاحب بیدل کے ہمنوا ہیں۔

بشر کو مشعل ایماں سے آگہی نہ ملی
دھواں وہ تھا کہ نگاہوں کو روشنی نہ ملی

اور پھر جس مشعل کو "شمع راہ زندگی" کے طور پر ہمیشہ کے لیے تھام لیا اور اس کے بعد ہر "ایمان" کی روشنی سے یکسر بے نیاز ہو گئے وہ تھی مشعل "حب بشر" جو رام کی نگاہ میں بھی عزیز و عظیم تھی اور رحیم کی نظر میں بھی ارفع و اعلیٰ۔

کیوں کسی ایماں سے مانگوں شمع راہ زندگی
کیا بشر کے واسطے حب بشر کافی نہیں

انسانیت پر ان کا ایمان اس قدر پختہ ہے کہ انھیں ہر فرد میں خواہ وہ ان کا دشمن ہی کیوں نہ ہو پہلے انسان نظر آتا ہے بعد میں کچھ اور۔ حضرت علی سے متعلق اک روایت ہے کہ

ایک بار ان کے اک ایسے دشمن کو گرفتار کر کے ان کے سامنے لایا گیا جو اُن کے خون کا پیاسا تھا اور ان پر قاتلانہ حملہ کر چکا تھا۔ حضرت علیؓ نے اس شخص کی طرف دیکھا۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں۔ خوف اور

دہشت سے حلق خشک ہو رہا تھا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا: اس کی رسیاں کاٹ دو۔ اسے پانی پلاؤ۔ یہ تو بہت پیاسا لگتا ہے۔ انتہا ہے اس جذبہ انسان دوستی کی، کہ اپنے ہی خون کا پیاسا سامنے کھڑا ہے بے دست و پا، سزا کا منتظر، مگر اس شخص میں انھیں اپنے خون کا پیاسا نظر نہیں آیا، پہلے وہ انسان نظر آیا جو صرف پیاسا تھا۔ یہی ہے انسانی کردار کی وہ عظمت جس کی طرف ملّا صاحب نے اشارہ کیا ہے۔

پتھر بھی پگھلتا ہے اپنا تو یہ ایماں ہے
ڈھونڈو گے تو پاؤ گے دشمن میں بھی انساں ہے

شاید عالم انسانیت کی خدمت کا یہی شوق انھیں عدل و انصاف کے مندر سے کھینچ کر قصرِ سیاست تک لے گیا۔ لیکن سیاست اور حق گوئی میں جنم جنم کا بیر رہا ہے۔ سیاست نام ہے موقع طلبی کا مصلحت اندیشی کا۔ اور مصلحت اندیشی کی دبیز چادر میں ہمیشہ انھیں اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا ہے سیاست میں حق گوئی کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ وہاں صرف اس دماغ کا سکہ چلتا ہے جس کے فیصلے وقت کے تقاضوں کے تابع ہوں۔ وہاں دل کی آواز کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔ اسی لیے شاید سیاست اور ملّا صاحب دونوں ہی ایک دوسرے کے زیادہ قریب نہ آسکے۔ خود بقول ان کے۔

وہی بے باکی و حق گوئی ملّا ہے ابھی
کاش اس کو کبھی جینے کا سلیقہ آجائے

ملّا صاحب کو کبھی "جینے کا سلیقہ" نہ آنا تھا نہ آیا اور آتا بھی کیسے۔ انھوں نے اپنے اندر کے انسان کو کبھی سونے ہی نہ دیا۔ دل کا فیصلہ ان کی عدالت میں ہمیشہ آخری فیصلہ رہا۔ جس کے خلاف عقل کی ہر اپیل مسترد کی گئی۔

اقبال کا ایک نہایت حسین شعر ہے:

نشیمن ہر دو را در آب و گل لیکن چہ راز است این
خرد را صحبتِ گل خوشتر آید دل کم آمیز است

اور عقل کی مادہ پرستی کو لے کر یہی سوال ملّا صاحب نے نہایت خوب صورت انداز میں اٹھایا ہے۔

ہر طرف عقل ہی کے ہنگامے
دل کی آواز کھو گئی ہے کہاں

ملا صاحب کی یہ سوچ ان کی شاعری میں نہایت موثر طریقہ پر جگہ جگہ نمایاں ہے۔ اس موضوع پر ان کے اشعار تقریباً ہر غزل کا اک حصّہ ہیں۔ انھوں نے ایک ہی موضوع کو بار بار مگر ہر بار قطعی مختلف اور نہایت موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ جس سے نہ صرف فن شاعری میں ان کی با کمال صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ موضوع جو اپنے آپ میں اک اعلیٰ کردار کی وہ تمام وسعتیں سمیٹے ہوئے ہے جو یکجا بہت کم ملتی ہیں ان کے دل و دماغ پر کس طرح حاوی ہے۔ لفظوں کا نہایت نفیس انتخاب، ان کی بندش اور شعر کی تاثیر کے اعتبار سے ان کے اشعار کہیں کہیں اس مقام پر نظر آتے ہیں جہاں اگر اردو فارسی کا امتیاز نہ ہوتا تو بادی النظر میں یہ تمیز کرنا مشکل ہے کہ یہ شعر یا یہ خیال میرزا بیدلؔ کا ہے۔ یا ملا صاحب کا۔

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو سمن درآ
توز غنچہ کم نہ دمیدہ ای در دل گشا بہ چمن درآ

لیکن ملا صاحب نے اپنے اک شعر میں اسی دل کو نہ جانے کتنے آسمانوں کی اونچائی بخش دی ہے ان کا کہنا ہے۔

نہ عقل کے کوہِ نور پر ہے نہ دیں کی وادی راز میں ہے
بشر کی سب سے جمیل تصویر دل کے سوز و گداز میں ہے

یا

عقل و خرد بجا مگر دل کا بھی حق ہے زیست پر
کوئی گھڑی تو بارِ ہوش سر سے گرا کے بھول جا

بالکل یہی خیال اور تقریباً اسی انداز میں مرزا بیدل کے یہاں ملتا ہے

باہر کساں اند کی آشفتگی خوش است
ہر چند عقلِ کل شدہ ای بے جنوں مباش

شاعری میں ملا صاحب کی فنکارانہ صلاحیتوں کو یقیناً کم نظیر کہا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کی شاعری کا وہ حصہ جس کا تعلق ان کی روح سے، ان کے مجروح احساسات سے اور ان کے دل کی گہرائی سے ہے اسے فنکارانہ کوشش کہنا ان کی تپشِ قلب کو سمجھنے میں بھول کرنے کے مترادف ہوگا۔ وہ تو اصل میں اک لاوا ہے

جو پہاڑ کا سینہ چیر کر اُبل جانے کے لیے بیتاب ہے۔ سمندر کی وہ موج ہے جو کبھی تو چاند کی کشش اور دوسرے بیرونی اثرات کے باعث اور کبھی خود سمندر کے سینے میں انگڑائیاں لیتے ہوئے مدوجزر سے متاثر ہو کر شوریدہ سری پر آمادہ ہے۔ جہاں ان کا بے باک قلم خود بخود لاوا اگلنے لگتا ہے:

وفاکیشی بغاوت بن نہ جائے کب تلک آخر
قفس کو دل پہ پتھر رکھ کے اپنا آشیاں سمجھوں

یا

تجھے مذہب، مٹانا ہی پڑے گا روئے ہستی سے
ترے ہاتھوں بہت توہین آدم ہوتی جاتی ہے

یا اک جگہ کہتے ہیں؛

میں نالہ بہ لب اجڑے نشیمن پہ نہیں ہوں
دیکھی نہیں جاتی ہے گلستاں کی تباہی

جذبہ فداکاری اور ازخود گذشتگی کی اس سے بہتر اور کیا مثال ہو سکتی ہے۔

اس کے ساتھ ہی جہاں ملا صاحب کی شاعری میں ان کے احساسات سب سے زیادہ مجروح اور ان کا آبگینہ دل پارہ پارہ نظر آتا ہے وہ ہیں آج کی بدلتی ہوئی قدریں، بے حسی، خودکامی، افراتفری اور تشدد کا یہ دور، جہاں بے سبب انسان انسان کے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔ بے گناہ لوگ گھروں میں، سڑکوں پر، بازاروں میں حتیٰ سفر میں کتے، بلی کی طرح بے بسی کی موت مارے جا رہے ہیں۔ جہاں ہنستے بستے شہر جل رہے ہیں۔ جہاں پرامن اور نہتے بے گناہ انسانوں پر رات دن شاہ ابلیس کی فوجوں کی یلغار ہے۔ جہاں وطن کے قیمتی قیمتی سپوت بموں اور گولیوں کا نشانہ بن رہے ہیں۔ جہاں گلی گلی ہمارے اُن نوجوان زندہ بچوں کی چتائیں شعلے اگل رہی ہیں جن کے مضبوط ہاتھوں میں ہمارا اچھا کل ہونا چاہیے تھا۔ جہاں آزادی کے چالیس سال بعد بھی ملک کا اک کثیر طبقہ بھوک، بیماری، زور زبردستی اور ناداری کا شکار ہے۔ جہاں ایک طرف خالی پیٹ برہنہ حال اور بھولی جنتا کی بے مقصد تالیوں کے درمیان سیاست کے سفید پوش مداریوں کے تماشے، شطرنجی چالیں، پینترے بازیاں جھوٹے وعدے اور کھوکھلے نعرے ہیں تو دوسری طرف کچھ ایسے ہی نام نہاد راہنماؤں کے اشاروں پر

خود رام ورحیم کے فرضی شیدائیوں کے ہاتھوں رام ورحیم کے احکامات کی بے حرمتی۔ مذہب کے نام پر فتنہ وفساد، ملک کو کمزور کرنے کی سازشیں، جہاں ہر فریق اپنے کو 'حق' اور دوسرے کو باطل مان کر ایک دوسرے کو مٹانے پر تلا ہے۔ جہاں خود بقول ملا صاحب کے :

نیکی و شر میں کوئی جنگ نہ ونگ　　　لڑ رہی ہے بدی بدی سے یہاں
سب چھپائے ہوئے ہیں سینے میں　　　اپنے اپنے الگ الگ شیطاں

اور جہاں :

معبد انسان بنے کیسے یہ ضد ہر دل میں ہے
اس کی پیشانی پہ ہو میرے ہی بت خانہ کا نام

اور جہاں :

فطرت کے تقاضوں پر پہرے ہیں آج بھی رسم و ایماں کے
قیدی کے فقط بہلانے کو دربان بدلتے رہتے ہیں

ملا صاحب نے گرم گرم مگر کھوکھلے نعرے لگانے والوں اور طرح طرح کے نقاب پہن کر بھولے بھالے عوام کی خدمت کا دم بھرنے والے روباہ صفت تاجروں کے چہروں کو جس طرح بے نقاب کیا ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے۔

نعرۂ گرم انقلاب میں نے بھی ہاں سنا تو ہے
جام وسبو کے آس پاس دار ورسن سے دور دور

اس موضوع پر شاید اس سے بہتر کہنا ممکن نہیں۔ یا

دنیا ہے نقابوں کا میلہ نقلی چہرے جھوٹی باتیں
اوڑھے ہے رِدائے شبنم جو اکثر وہ شرر اندام بھی ہے

ملا صاحب کا یہ قیمتی شعر سرمد شہید کی اس رباعی کی یاد تازہ کر دیتا ہے جس میں انھوں نے اس قسم کے خرقہ پوش شیطانوں کا بڑے موثر انداز میں پردہ فاش کیا ہے ملاحظہ ہو :

این خرقۂ پشمینہ کہ زنار دراوست　　　مکراست و ریا فتنہ بسیار دراوست
بر دوش مکش، دست بکش تا نہ کشی　　　وین بار ندامت کہ صد آزار دراوست

ملا صاحب ان خوش نصیب انسانوں میں سے ہیں جنھیں شاید قدرت نے عمر کے ہر حصے میں بڑے بڑے مناصب و مراتب سے نوازا ہے۔ عمر کا بیشتر حصہ قانون کی گتھیاں سلجھانے اور عدل و انصاف کی خدمت کرنے میں صرف کیا۔ ایک مدت تک خود عدالتِ عالیہ میں میزانِ عدالت کے پاسبان رہے۔ پھر کچھ عرصہ لوک سبھا اور اس کے بعد راجیہ سبھا میں رہ کر جس قدر بن پڑا ملک و قوم کے تئیں اپنا فرض نبھایا آج بھی نہ جانے کتنے ادارے اور انجمنیں ایسی ہیں جن کی زندگی میں ان کا اک اہم رول رہا ہے۔ عرش کی ان بلندیوں سے فرش کی پستیوں پر بدحالی کی زندگی جینے والے عام انسانوں کی اس قدر صاف تصویریں لے لینا ان کے ذہن اور ان کی نگاہ کے کیمرے کی غیر معمولی سچائی اور بے حد حساس ہونے کی دلیل ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ پنڈت آنند نراین اور ملا دو الگ الگ کردار ہیں جو شخص حکومت ہند کے ایوانوں میں بیٹھا ہوا عام انسانوں کی فہم سے بہت اونچے قسم کے مسائل سے الجھتا رہا وہ صرف آنند نراین پنڈت تھا ملا نہیں۔ ملا تو ہمیشہ گاؤں گاؤں، شہر شہر وہاں کی تنگ و تاریک بدبودار گلیوں میں، سڑکوں پر، بازاروں میں، بھوک و افلاس کے مارے ہوئے عام انسانوں کی بستیوں میں گھومتا رہا۔ ان کی بدحالی پر کڑھتا رہا۔ ان کے درد کا مداوا ڈھونڈتا رہا اور جب جب بھی پنڈت آنند نراین سے اس کا سامنا ہوا۔ اس نے ہر رشتہ اور ہر تعلق کو بالائے طاق رکھ کر نہایت صفائی اور بے باکی سے اپنی جمہوریت کے کھوکھلے پن کی شکایت کی کیوں کہ ہندوستان کے آئین کا ایک سچا اور وفادار پاسبان ہونے کے ناتے وہ یہ جانتا ہے کہ جس نظام میں مساوات کو اولیت حاصل نہیں وہ جمہوریت کا نظام نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے وہ برملا کہتے ہیں:

نظامِ میکدہ ساقی بدلنے کی ضرورت ہے
ہزاروں ہیں صفیں جن میں نہ مے آئی نہ جام آیا

یا

ثبات پا نہ سکے گا کوئی نظامِ چمن
فسردہ غنچوں کو جس میں شگفتگی نہ ملی

آج ہندوستان کی آزادی کو چالیس برس بیت چکے ہیں۔ اس آزادی کو حاصل کرنے

کے لیے قوم کے سرفروش جیالے آزاد ہندوستان کے کیسے کیسے حسین خواب آنکھوں میں سجائے ہنستے ہنستے پھانسی پر جھول گئے تھے۔ لیکن ان چالیس سالوں میں جس بے دردی سے ان کے خوابوں کے محل مسمار کیے گئے۔ ان کی ارمانوں کی چتائیں جلائی گئیں وہ اک ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔ شاید انھیں معلوم نہیں تھا کہ آنے والی نسلوں کے خواب ان کے خوابوں سے الگ ہوں گے۔ شاید وہ نہیں جانتے تھے کہ "رات جاکر بھی رات آئے گی" اس درد کو وہی انسان محسوس کر سکتا ہے۔ جو ان سرفروشانِ وطن کی آنکھوں میں سجے ہوئے آزاد ہندوستان کے خوابوں کا شریک ہے۔
ملا صاحب کی پوری شاعری میں یہ درد جگہ جگہ کروٹیں لیتا نظر آتا ہے۔

ہو گئی گم کہاں سحر اپنی
رات جاکر بھی رات آئی ہے

یا

ابھی تک تو وہی ترتیبِ تاریخ گلستاں ہے
خزاں کے دور پھر پھر کر بہ اعلان بہار آئے

انتظارِ فصل گل میں کھو چکے آنکھوں کا نور
اور بہار باغ لیتی ہی نہیں آنے کا نام

اور اس پر طرہ یہ کہ ؛

باغباں کے حکم سے اب کوئی ویرانہ نہیں
اب تو شالی مار ہے ہر ایک ویرانے کا نام

لیکن ان تمام حالات کے باوجود ان کی شاعری میں صرف مایوسی اور بد بینی کا اندھیرا نہیں بلکہ جگہ جگہ امید کا اجالا ہے، عزم، ہمت اور جہد مسلسل کا پیغام ہے۔ انھیں اس "دورِ ظلمت" میں بھی کہیں کہیں دیے جلتے نظر آتے ہیں۔ ان کے بقول آج بھی ؛

رنگِ طوفاں سے میں نہیں مایوس
ہے یقیں موجِ تہ نشین پہ ابھی

ان کا عقیدہ ہے :

جب بھی گھری ہے موجوں میں کشتی حیات کی
ابھرے ہیں موج ہی سے کنارے نئے نئے

اور یہی عقیدہ بنیاد ہے ان کے اس دعوے کی :

وادی نور بنے گی یہی شعلوں کی زمیں
ابھی مٹی کے فرشتے سے میں مایوس نہیں

ملا صاحب کی شخصیت اور ان کے کردار کو جب ہم ان کی شاعری کے آئینہ میں دیکھتے ہیں تو ان تمام خصوصیات کے ساتھ جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، ان کے کردار کی ایک اور تصویر بھی ابھر کر سامنے آتی ہے اور اس تصویر میں ان کے انداز فکر اور طرز تخاطب کے پیچھے کہیں آج کے دور کا اقبال بولتا نظر آتا ہے۔

بخود خزیدہ و محکم چو کوہسارا ن زی
چو خس مزی کہ ہوا تیز و شعلہ بے باک است

اقبال کا یہ شعر آج کے اس مہیب دور میں، جہاں انسانی اقدار کے زوال اور وحشت گری کے عروج نے اچھے اچھوں کے قدم ڈگمگا دیے ہیں، ثابت قدمی اور استقامت کا پیغام ہے۔ لیکن ملا صاحب صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے وہ اپنے "طایر" کو تیز منقار و ناخن سے مسلح بھی دیکھنا چاہتے ہیں ان کا کہنا ہے :

اس فضا میں تجھ کو جینا ہے تو اے طائر ذرا   تیز رکھ منقار و ناخن بال و پر کافی نہیں

آخر میں نہایت ایمانداری کے ساتھ میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ میری یہ ادنیٰ سی کوشش کچھ مرے اپنے قلم کی محدودیتوں کے باعث اور کچھ تنگیٔ وقت کے سبب کافی حد تک اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کرنے سے قاصر رہی ہے۔

بارگاہ ایزدی میں میری دعا ہے کہ ان کا متبرک سایہ صحت و سلامتی کے ساتھ ان کے چاہنے والوں کے سروں پر عرصہ دراز تک قائم و دائم رہے۔ اور بقول میرے محترم بزرگ جناب مالک رام صاحب ہم سب اسی جگہ ان کی سوویں سالگرہ کا جشن منائیں۔ آمین

خلیق انجم

اردو شاعری کی منفرد آواز

پچھلے پچاس ساٹھ سال میں اردو شاعری میں جو چند معتبر اور منفرد آوازیں ابھریں ہیں ان میں ایک ممتاز آواز پنڈت آنند نرائن ملاّ کی بھی ہے۔

ملاّ صاحب نے شاعری کا آغاز اس زمانے کے لکھنؤ میں کیا تھا جب صفی لکھنوی، عزیز لکھنوی اور ثاقب لکھنوی جیسے اساتذہ کا سکہ چل رہا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب غزل ہی سب سے مقبول صنفِ سخن تھی۔ زیادہ تر حسن وعشق کے روایتی مضامین ہی غزل کے موضوعات میں شامل تھے۔

لکھنؤ میں ملاّ صاحب سے کچھ پہلے صرف چکبست ایسے شاعر تھے، جن کی شاعری میں بیسویں صدی کے ابتدائی پندرہ بیس سال کے ہندوستان کی سیاسی اور سماجی زندگی کی عکاسی ملتی ہے۔ لیکن چکبست کے موضوعات کا دائرہ خاصا محدود تھا۔

اس اعتبار سے لکھنؤ میں چکبست کے بعد دوسرا نام ملاّ صاحب ہی کا ہے، جنھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے نصف صدی سے زیادہ عرصے تک زندگی اور انسانیت کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ ملاّ صاحب کی شاعری کا افق بہت وسیع ہے اور یہ متنوع موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔

ملاّ صاحب کے زمانے تک لکھنؤ کی تہذیبی فضا میں شعر گوئی اور سخن فہمی دونوں علم مجلسی کا حصہ تھے۔ انھوں نے اپنی فکر اپنے خیال اور اپنے احساس وادراک کے اظہار کے لیے شاعری کا میڈیم اختیار کیا۔ انھیں نظم اور غزل دونوں اصناف پر پوری قدرت ہے۔ انھوں نے نظم گوئی سے شاعری کی ابتدا کی۔ جس کا ذکر آگے آئے گا۔

ملاّ صاحب کی شاعری صرف ایک فردِ واحد کے ہی دل کی آواز نہیں بلکہ یہ اس پورے عہد کی صدائے بازگشت ہے جس میں ملاّ صاحب جی رہے ہیں۔ ملاّ صاحب کے دور کا اجتماعی شعور ان کی شاعری کا سب سے نمایاں آہنگ ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ملاّ صاحب کی شاعری اردو کی تمام

صالح روایتوں کی امین بھی ہے اور عصری زندگی کے تقاضوں سے ہم کنار بھی۔ انھوں نے روایت کی پاس داری کرتے ہوئے لیکن فرسودگی سے دامن بچاتے ہوئے اپنا تخلیقی سفر طے کیا ہے۔ اس لیے وہ اپنے عہد کے فکری اور فنی تقاضوں سے منحرف نہیں ہیں۔ ملّا صاحب نے اپنے طویل تخلیقی سفر کے دوران غزل کو بُری طرح معتوب ہوتے ہوئے بھی دیکھا اور اسے ایک نئی تازگی کے ساتھ دوبارہ زندہ ہوتے ہوئے بھی دیکھا۔ اس پورے عرصے میں غزل کے ساتھ ان کی مستقل اور غیر مشروط وفاداری ان کے سلیم الطبع ہونے کی دلیل ہے۔ اس لیے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اس دور میں جن شاعروں نے غزل کو نئے تیوروں سے سجایا ہے ان میں ملّا صاحب بھی ایک ہیں۔ غزل کو خطاب کرتے ہوئے ملّا صاحب کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

دلہن تھی تجھے میں نے ساتھی بنایا
شبستاں سے میدان میں کھینچ لایا
ترے نرم لہجے کو للکار دے دی
ترے دستِ نازک میں تلوار دے دی
دیا دردِ انساں کا احساس تجھ کو
کھڑا کر دیا نظم کے پاس تجھ کو

غزل کے بارے میں ملّا صاحب کی ایک مسلسل غزل کے یہ چند اشعار بھی دیکھیے:

غزل محفل میں تیری پینے والوں کی کمی کب تھی
مگر ان پینے والوں میں مری شائستگی کب تھی
لب و رخسار کے قصّے، نگاہ و دل کے افسانے
ترے ہونٹوں پہ لیکن آیتِ پیغمبری کب تھی
شعورِ اجتماعی ثبت جس پر خاص مہریں تھیں
تری حد تھی تجھے حاصل یہ انساں آگہی کب تھی
غزل اک نام تھا ناکامیوں پر سینہ کوبی کا
مرے پہلے یہ بانگِ کاروانِ زندگی کب تھی

غرض ملّا صاحب کی شاعری نئے سفر، نئی سمت اور نئی منزل کی تلاش کی شاعری ہے۔ اور بقول ملّا صاحب :

اب آگے تیری قسمت ہے اے قافلۂ گمراہِ بشر
میں نے تو اندھیری راہوں میں کچھ دیپ جلا کر چھوڑ دیے
اس بحث کو چھوڑو، خود ملّا پہنچا کہ نہ پہنچا منزل تک
لیکن اس نے یاروں کو نئی کچھ راہیں دیں، کچھ موڑ دیے

ملّا صاحب کی شاعری ایک انسان دوست کی شاعری ہے، ایک ایسے دردمند انسان کی شاعری جس پر امیر مینائی کے اس مصرعے کا "سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے" بھرپور اطلاق ہوتا ہے۔ انسان دوستی کی باتیں یوں تو بہت سے شعرا نے کی ہیں لیکن اسے مسلک کے طور پر اپنانے والوں میں غالب کے بعد شاید سب سے نمایاں نام ملّا صاحب ہی کا ہے۔

غالب سے قبل اردو شاعری میں انسان دوستی کا نظریہ تصوف کے راستے وارد ہوا تھا جب کہ غالب کے ہاں یہ نظریہ ان کی فکر اور عقیدے کی اساس بن کر آیا ہے۔

غالب قومی یکجہتی کے نہیں بلکہ انسانی یکجہتی کے نقیب تھے وہ انسانیت کو قوموں یا گروہوں یا دوسرے لفظوں میں جغرافیائی اور مذہبی حدود میں تقسیم نہیں کرتے تھے۔ غالب کا یہ شعر اُن کے مسلک کی مکمل ترجمانی کرتا ہے :

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

ملا صاحب نے جب اردو میں شعر گوئی کا آغاز کیا تو انھیں انگریزی میں شعر کہتے ہوئے آٹھ دس سال ہو چکے تھے۔ انھوں نے ۱۹۲۳ء میں انگریزی میں ایم۔ اے کیا تھا۔ ایم۔ اے کرنا تو غیر معمولی بات ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ملّا صاحب نے انگریزی ادب کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا۔ یہ وہ عہد تھا جب انگریزی ادب کا مطالعہ کرنے والوں کو اردو میں صرف غالب ہی متاثر کر سکتا تھا۔ ملّا صاحب بھی غالب سے اور اس کے بعد اپنے ہم عصروں میں اقبال سے متاثر ہوئے۔ ان کا کہنا ہے کہ انھوں نے طالب علمی کے زمانے میں نہ جانے کتنی بار شروع سے آخر تک دیوانِ غالب پڑھا ہو گا۔ سارے کا سارا دیوان انھیں

حفظ تھا۔ غالب سے ملّا صاحب کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے کلامِ غالب کے کچھ حصّوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ پوری گفتگو میں نے صرف یہ بتانے کے لیے کی ہے کہ ملّا صاحب کی شاعری کی بنیاد انسان دوستی پر ہے وہ انسانیت کو کُل کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ اسے جغرافیائی اور مذہبی خانوں میں تقسیم نہیں کرتے۔

بیسویں صدی کے نصف اوّل میں برطانوی سامراج ہندوستانی سیاست کو ہندو اور مسلم سیاست میں تقسیم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس فرقہ پرست سیاست کا سب سے بڑا اسٹیج یوپی تھا۔ جہاں ملّا صاحب کی زندگی کا بڑا حصہ گزرا ہے انسانی اور عالمی قدروں پر ملّا صاحب کا ایسا پختہ ایمان تھا کہ ان کے قدموں میں ذرا بھی لغزش نہیں آئی مجھے پچھلے تقریباً پندرہ سال سے ملّا صاحب سے قربت کا فخر حاصل ہے۔ بارہا آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد کی ہندوستانی سیاست پر ان سے گفتگو بھی ہوئی ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات پر بھی تبصرے ہوئے ہیں۔ میں نے اچھے سے اچھے کشادہ اور سیکولر ذہن کے لوگوں کو تنگ نظری کے دامن میں پناہ لیتے دیکھا ہے، لیکن فرقہ پرستی کے تیز طوفانوں میں بھی ملّا صاحب نے انسانیت کی شمع کو روشن رکھا اور بڑے سے بڑے منافع کے لیے بھی انھوں نے اپنے رنگ و بو کے خوابوں کا سودا نہیں کیا۔ انسان دوستی ملّا صاحب کے لیے کوئی ایک ایسی نقاب نہیں جسے وہ اپنے چہرے پر لگا کر ادب یا سماج میں کوئی جھوٹا وقار حاصل کرنا چاہتے ہوں۔ انھوں نے 'میری حدیثِ عمرِ گریزاں' کے دیباچے میں لکھا ہے۔ "میں شاعر کو صرف فنکار نہیں سمجھتا بلکہ دانائے راز اور پیمبر بھی سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک کوئی شاعر یا افسانہ نگار نوعِ انساں سے بے پناہ محبت کیے بغیر عظیم نہیں ہو سکتا اور نہ وہ ادبِ عالیہ پیش کر سکتا ہے۔ نوعِ انساں سے اس طرح محبت کرنے والا اجتماعی مفاد کو انفرادی آسودگی پر قربان کرنے کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتا اور اس کی زندگی اور پیام میں بھی کوئی اس قسم کا تضاد پیدا نہیں ہو سکتا . . . . میرا اپنا عقیدہ تو یہی ہے کہ جس ادب میں انسانی درد کی آواز نہیں، وہ زیادہ سے زیادہ ذہنی عیاشی کے لیے سامان فراہم کر سکتا ہے لیکن دل و دماغ کی تربیت نہیں کر سکتا۔ کلام میں تاثیر خلوص سے پیدا ہوتی ہے اور عظمتِ انسانی، درد کی آواز شامل کرنے سے۔ وہی شاعر ادبِ عالیہ پیش کر سکتا ہے، جس میں یہ دونوں باتیں موجود ہوں۔"

(میری حدیثِ عمرِ گریزاں ص پ)

جب انسان کی کمر سیدھی ہوئی، اس نے سماجی زندگی کا آغاز کیا اور اس کے شعور میں وسعت پیدا ہوئی تو سچائی اور حقیقت کی کھوج اور حق و باطل یا تیرگی اور نور کی جنگ نے اس کے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ لاکھوں برس گزرنے کے باوجود ابھی تک یہ جنگ جاری ہے۔ ملّا صاحب کی شاعری میں انسان کی شکست و فتح، خوشی و غم اور مسلسل جدوجہد کی عکاسی ان الفاظ میں ہوئی ہے :

خستگی و تشنگی و رہزن و ریگ و سراب
کتنی صدیاں ہوگئیں، انسان چلتا جائے ہے

مشعلِ دل بھی تو سینے میں فروزاں چاہیے
راہِ منزل میں چراغِ رہ گزر کافی نہیں

ہونٹوں پہ رہا پیغامِ سحر، مٹی پہ قدم، تاروں پہ نظر
راتوں میں کٹی، راتوں میں مگر خوابوں کے اُجالے جوڑ دیے

یہ عقل کی مادہ پرستی، مزاجِ دنیا بدل رہی ہے
یہ روحِ انساں کو رکھ کے اپنے قدم کے نیچے کچل رہی ہے

کبھی شاید یہ محفل بھی ستاروں سے چمک اُٹھے
ابھی تو اشکِ بے کس سے چراغاں ہے جہاں میں ہوں

جہادِ زیست کے تپتے ہوئے بیاباں میں
اٹھائے سر، شجرِ سایہ دار ہیں کیا کیا

پھر جہلِ گزشتہ کی ہے دنیا متلاشی
دانائی امروز سے گھبرائی ہوئی سی

ملّا صاحب انسانی زندگی کے نشیب و فراز سے بخوبی واقف ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر ارتقا کی منزلوں میں انسان نے کبھی کبھی تاریکیوں سے شکست کھائی ہے تو اکثر تاریکیوں کو پسپا بھی کیا ہے۔
ملّا صاحب انسانیت سے نا امید نہیں ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ:

یاس کی آندھیوں میں بھی دل سے کبھی مٹی نہ آس
گم ہوئی لو ہزار بار شمع کبھی بجھی نہیں

تیرگی بڑھ بڑھ کے تاروں کو بجھاتی ہی رہی
تیرگی کو چیر کر تارے نکلتے ہی رہے

جب بھی گھری ہے موجوں میں کشتی حیات کی
ابھرے ہیں موج ہی سے کنارے نئے نئے

کرب میں کپکپا رہی ہے مادرِ عالم
اک نیا دور لے رہا ہے جنم

کیسے عزم اور حوصلے کے ساتھ ملّا صاحب ابھرتے ہوئے نئے سورج کی نشان دہی کرتے ہیں:

فضا کی تیرگی نیم شب سے کر نہ قیاس
افق کی گود میں ننھا سا آفتاب بھی دیکھ

وہ پیشِ نظر ہے وادیٔ گل، ہمت سے ذرا اک اور قدم
اب کوہ تو تو سر کر ہی چکا، تھوڑی سی ترائی باقی ہے

اس موضوع پر ملّا صاحب کی ایک نظم "میری دنیا" کے کچھ شعر سنیے:

شعلوں میں تیرے تپ کر انساں پگھل گئے ہیں
بازارِ زندگی کے سکّے بدل گئے ہیں

طاقت کی ہے پرستش اب تیرے معبدوں میں
سونے کے دیوتا ہیں، تیرے صنم کدوں میں

دل کانپتا ہے میرا انساں کی طاقتوں سے
لگتا ہے خوف مجھ کو اونچی عمارتوں سے

انساں اتر رہا ہے رسمِ درندگی پر
تہذیب آگئی ہے حدِ برہنگی پر

کیا جہدِ زندگی میں طبعِ بشر یہی ہے
سو بار موت بہتر، جینا اگر یہی ہے

ملّا صاحب کی شاعری کا بڑا حصّہ محض جذبے اور احساس کی ترجمانی نہیں بلکہ ایک دردمند دل رکھنے والے دانشور کا فکری اظہار بھی ہے وہ ایسی دنیا اور ایک ایسے سماجی نظام کے متلاشی ہیں، جس میں انسان سکون اور آرام کی زندگی گزار سکے جہاں اس کا جسم اور دماغ کسی طاقت، ظلم، جبر اور استبداد کا شکار نہ ہو اور جہاں اس کے فکر، احساس اور اس کے اظہار کے پیروں میں بیڑیاں نہ ڈالی جائیں۔ ملّا صاحب نے ایک خطبے میں اس خیال کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا: تاریخِ عالم ہم کو بتاتی ہے کہ روزِ آفرینش سے لے کر آج تک طفلِ انساں نے ہمیشہ ایک ایسے نظامِ ہستی کے خواب دیکھے، جس میں وہ اپنے شوق کی زندگی آزادی کے ساتھ بسر کر سکے۔ اس کا اپنا گھر ہو جہاں وہ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ جب کارِ دنیا سے فرصت پائے تو کچھ لمحات سکون اور آرام کے ساتھ گزارے۔ اس کے جسم کو کسی جبر کے شکار بننے کا اندیشہ نہ ہو اور اس کے ذہن کو غلام بنانے کی کوشش نہ کی جائے۔ اُسے امن اور محبت کی کھلی اور بے خوف فضا میں سانس لے کر اپنے پورے انسانی قد تک پہنچنے کا موقع ملے۔ جہاں افسروں کی نہیں بلکہ قانون کی حکومت ہو جہاں اسے الزامات کے خلاف اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے بے روک ٹوک پورا پورا اختیار دیا جائے اور جہاں آزادی، مساوات اور اخوت کے نعروں میں نہیں بلکہ نغمات کی لے میں مذہب و ملت، رنگ و نسل

اور جنس و ذات کے سارے امتیازات، اختلافات اور تفرقے ایک نالۂ بے آواز بن کر فنا ہو جائیں" (کچھ نثر میں بھی، ص ص ۱۰۱۔۱۸) ملا صاحب نے اپنی نظم "گمراہ مسافر" میں انسان کے اسی کرب کو بڑے بھرپور انداز میں پیش کیا ہے۔

دنیا کے اندھیرے زنداں سے انساں نے بہت چاہا نہ ملا
اس غم کی بھول بھلیاں سے باہر کا کوئی رستا نہ ملا
اہلِ طاقت اٹھتے ہی رہے بھاری بھاری تیشے لے کر
دیوار پسِ دیوار ملی دیوار میں دروازا نہ ملا
ایماں کا فسوں گر بھی آیا جادو کا عصا ہاتھوں میں لیے
اک لکڑی تو اندھے کو ملی آنکھوں کو مگر جلوا نہ ملا
ساقیِ سیاست محفل کے جام و مینا بدلا ہی کیا
جس میں اک تہہ تلخی کی نہ ہو کوئی شیریں جرعا نہ ملا
دولت کا مغنی بھی آیا مضرابِ فراموشی لے کر
ہر ساز سے اک نغمہ پھوٹا لیکن دل کا پردا نہ ملا
رقاصۂ عشرت نے آکر پھر دل سے نکالیں کچھ پھانسیں
لیکن اس کی چٹکی کو بھی جو روح میں کانٹا تھا نہ ملا
تقسیم مساوی کے حامی پھرتے کے بڑھے میزان اپنا
جو سب کو یکساں تول کے دے میزان میں وہ پلا نہ ملا
کچھ کیمیاگر پھر ذرّوں کا دل چیر کے لائے آگ نئی
شعلوں کی خدائی ہاتھ آئی شبنم کا مگر قطرا نہ ملا
بے چاری الفت کی مشعل کونے میں پڑی جل جل کے بجھی
لیکن اسے ہاتھوں میں لے کر کوئی بڑھنے والا نہ ملا
ار پھر کے وہیں پر آتا ہے انساں ہے رہ باطل پہ ابھی
صدیاں گزریں چلتے چلتے لیکن ہے اسی منزل پہ ابھی

انسان کے دکھ درد کا بھرپور احساس اور انتہائی موثر انداز میں اس کا اظہار ملا صاحب کی آواز کو انفرادیت بخشتا ہے پروفیسر احتشام حسین مرحوم نے ملاؔ صاحب کی شاعری کے اس منفرد انداز پر گفتگو کرتے ہوئے بہت صحیح لکھا تھا کہ "ان کے صاف، شفاف اور ذکی الحس ذہن اور انسانی دکھ درد کے تصور سے خون ہو جانے والے دل، دونوں نے مل کر ایک مخصوص شاعرانہ انداز سے زندگی کو فن کی گرفت میں لیا ہے" یہ ان کا ایسا انفرادی رنگ ہے جسے انھوں نے شاعرانہ، مترنم اور دلکش زبان میں پیش کیا ہے۔ اس رنگ میں ان کے حریف مشکل ہی سے نکلیں

ابھی روئے حقیقت پر پڑا ہے پردۂ ایماں
ابھی انساں فقط ہندو مسلماں ہے جہاں میں ہوں

طالب امن ہیں سب بزم میں لیکن ہر رند
لے کے اک ہاتھ میں تیغ ایک میں جام آتا ہے

معبد انساں بنے کیسے یہ ضد ہر دل میں ہے
اس کی پیشانی پہ ہو میرے ہی بت خانے کا نام

بشر کو مشعل ایماں سے آگہی نہ ملی
دھواں وہ تھا کہ نگاہوں کو روشنی نہ ملی

دیر و حرم کے معاملے میں ملاؔ صاحب کا ذہن بالکل صاف ہے۔ وہ تفریق کرنے والے مذاہب پر "حبِ بشر" کے مذہب کو ترجیح دیتے ہیں۔ کہتے ہیں:

کیوں کسی ایماں سے مانگوں شمع راہِ زندگی
کیا بشر کے واسطے حبِ بشر کافی نہیں

ایک اور شعر ملاحظہ ہو۔ جس میں ملاؔ صاحب نے شاعرانہ تعلی سے کام نہیں لیا بلکہ انسانیت کے پیغام کو عام کرنے کے لیے اپنی جدوجہد کا ذکر کیا ہے؛ شعر ہے:

اب آگے تیری قسمت ہے اے قافلۂ گمراہ بشر
ہیں مے تو اندھیری راہوں میں کچھ دیپ جلا کے چھوڑ دیے

اشعار کے مطالعے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انسان دوستی ملا صاحب کے لیے کوئی شاعرانہ موضوع نہیں بلکہ اس کی حیثیت ان کے ہاں ایک ایسے عقیدے کی ہے جس کے معاملے میں ان کے ساتھ کوئی سمجھوتہ ممکن نہیں۔ اردو میں یہ روایت رہی ہے کہ اگر شاعر نظم گو بھی ہے تو اس کی شعر گوئی کا آغاز غزل ہی سے ہوا ہے۔ علامہ اقبال اور جوش کی شاعری میں نظم کا پلّہ بھاری ہے۔ یہ دونوں نظم کے شاعر ہیں۔ لیکن ان دونوں نے ابتدا میں غزلیں ہی کہی تھیں۔ ملا صاحب نے شعر گوئی کی ابتدا نظم سے کی تھی۔ میرے ذہن میں اردو کا اور کوئی شاعر ایسا نہیں ہے، جس نے نظم گوئی سے اپنی شاعری کی ابتدا کی ہو۔ اس سے یہ تو پتا چلتا ہے کہ ملا صاحب عام ڈگر سے نچ کر خود اپنا راستہ بناتے ہیں۔ لیکن یہ اس حقیقت کا بھی ثبوت ہے کہ ملا صاحب کی شاعری میں فکر کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اگر وہ روایتی شاعری کرتے یا صرف جذبے پر زور دیتے یا صرف زبان و اظہار کو اہمیت دیتے تو غزل ہی سے ابتدا کرتے۔ ان کی پہلی نظم "پرستارِ حسن" ہے جس میں معنویت بھی ہے اور فکری عنصر بھی اس نظم میں اظہار کی جو پختگی، لہجے کی متانت اور بیان کی جو تازہ کاری ہے وہ بے شمار شاعروں کو مدتوں مشقِ سخن کے بعد بھی نصیب نہیں ہوئی۔

نظم میں ملا صاحب کے موضوعات متنوع ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا مشاہدہ اور تجربہ بہت وسیع ہے۔ انھوں نے زندگی کو ایک ہمدرد انسان کی حیثیت سے بہت قریب سے دیکھا ہے۔

ملا صاحب نے شملے کے دیودار — اور ایک دن انسان جیتے گا، 'ہمی'، اندھیر نگر میں دیپ جلیں، بڈھا، عصمتِ افلاس، گرو نانک، عقل و دل کا تضاد، بیسواں محبانِ وطن کا نعرہ، جوئے شیر، موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، مہاتما گاندھی کا قتل اردو کے نام، قحطِ کلکتہ، لال قلعہ، آخری سلام۔ وغیرہ جیسے موضوعات پر نظمیں کہی ہیں۔ بہت کم نظم گو شعرا کے یہاں موضوعات کا اتنا تنوع ملتا ہے۔

ملا صاحب نے شاعری میں افسانے بھی لکھے ہیں۔ ان کی اس طرح کی نظموں میں مریم ثانی، سماج کا شکار اور ٹھنڈی کافی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ مرزا شوق لکھنوی نے، مثنوی کی فارم میں افسانے بیان کیے تھے، جو خاصے طویل تھے۔ ملا صاحب نے نظم میں مختصر اور بہت موثر افسانے لکھے ہیں۔

ملا صاحب کی وطنی شاعری محض جذباتی نہیں ہے، بلکہ اس میں آہنی عزم کے جذبے کے ساتھ

فکر کا عنصر بھی شامل ہے۔ ان نظموں میں محض جذباتیت نہیں بلکہ منطقی استدلال بھی ہے۔ وطنی موضوعات پر ان کی نظمیں لال قلعہ، صبح آزادی، سجدۂ عقیدت، زمین وطن اور تاشقند جیسی نظمیں خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

فراقؔ کی سب سے بڑی خوبی یہ بتائی جاتی ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں ہندی کے ایسے الفاظ کا برجستہ استعمال کیا ہے۔ جو اردو میں مستعمل نہیں تھے۔ ملا صاحب کی اس خوبی کی طرف ہمارے نقادوں کی نظر نہیں گئی، ورنہ ملاؔ صاحب نے اپنی نظموں اور غزلوں میں ہندی الفاظ کا ایسا برجستہ استعمال کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اردو ہی کے الفاظ ہیں۔ ملا صاحب ایسی نظموں میں شعر کا جنم، اندھیر نگر میں دیپ جلیں اور سپنے بہت اہم ہیں۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں ہے۔

اپنے ذہنی رویئے کے اعتبار سے ملاؔ صاحب سو فی صدی ترقی پسند ہیں۔ لیکن انھوں نے کبھی بھی اپنی شناخت اس ترقی پسندی کے ساتھ نہیں کی جو ایک زمانے میں سکۂ رائج الوقت بن چکی تھی یہی وجہ ہے کہ جب احتشام حسین، آل احمد سرور اور بعض دوسرے نقادوں نے ان پر ترقی پسند کا لیبل چپکانا چاہا تو انھوں نے انھیں اس کی قطعی اجازت نہیں دی بلکہ اپنی نظم اور نثر کے ذریعے اس کی تردید کی۔ وہ سیاست کو ادب کا حصہ ضرور سمجھتے ہیں لیکن ادب کو سیاست بنانے کے قائل نہیں ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری میں نہ کوئی نعرے بازی ہے اور نہ ان کے ہاں انقلاب کی کوئی رومانی لے ہے۔ وہ اپنے حقوق کے حصول کے لیے تشدد کے بھی قائل نہیں۔ لیکن پھر بھی شاعری کے بارے میں ان کا ایک موقف ہے، وہ جو کچھ لکھتے ہیں پورے اعتماد کے ساتھ لکھتے ہیں اس اعتبار سے ان کی شاعری ترقی پسند تحریک کے اس منشور کی خلاف ورزی نہیں کرتی جو ۱۹۳۶ء میں جاری ہوا تھا۔

غالب کا یہ مصرع "ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم" ملاؔ صاحب کے لیے محض شاعرانہ خیال نہیں بلکہ عقیدے کی حیثیت رکھتا ہے ان کی فکر اور بصیرت کائناتی ہے ان کا ایک فلسفہ اور ایک ہی عقیدہ اور ایک ہی نظریہ ہے اور وہ ہے انسان دوستی۔ وہ انسانیت کو کُل کی حیثیت سے دیکھتے ہیں، اسے مذہبی یا جغرافیائی خانوں میں تقسیم نہیں کرتے۔ انھوں نے شاعری میں یہ عقیدہ روایتی مضمون کے طور پر بیان نہیں کیا بلکہ یہ عقیدہ ان کی گفتار اور کردار دونوں سے ہم آہنگ ہے۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

تجھے مذہب مٹانا ہی پڑے گا روئے ہستی سے
ترے ہاتھوں بہت توہینِ آدم ہوتی جاتی ہے

ہر دیر و حرم سے کترا کر ملاّ آیا مے خانے میں
ملاّ کے سے لیکن دنیا میں سلجھے ہوئے انسان کتنے ہیں

بشر کے ذوقِ پرستش نے خود کیے تخلیق
خدا و کعبہ کہیں اور کہیں صنم خانے

ملاّ صاحب اردو کے معاملے میں صرف قلم کے میدان کے ہی مرد نہیں وہ اردو تحریک کے بھی قافلہ سالاروں میں رہے ہیں۔ دس سال تک وہ ہندوستان کے سب سے بڑے ادارے یعنی انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر رہے ہیں۔ صدر کی حیثیت سے انھوں نے مرکزی اور صوبائی حکومت کے مختلف ذمہ داران کو بہت بڑی تعداد میں میمورنڈم پیش کیے ہیں۔ اور انھوں نے اردو کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف زبردست احتجاج کیا ہے۔ انھوں نے اردو کے جائز حقوق کے لیے مطالبے کیے ہیں جناب اندر کمار گجرال کی چیرمین شپ میں مرکزی حکومت کی قائم کردہ کمیٹی برائے فروغ اردو کے سامنے بے شمار اردو والے پیش ہوئے اور انھوں نے اردو کے سلسلے میں مطالبات پیش کیے لیکن ملاّ صاحب نے جس مدلّل طریقے سے اردو کا مقدمہ پیش کیا وہ کوئی اور نہیں کرسکا۔ اردو والوں کی بدنصیبی تھی کہ مرکزی حکومت کے بعض بہت سینیئر وزیروں کی وجہ سے حکومت کو اس کمیٹی کی رپورٹ اور سفارشات سرد خانے میں محفوظ کرنی پڑیں۔

ملاّ صاحب کی مادری زبان اردو ہے اور وہ اس معاملے میں کسی سمجھوتے کے لیے تیار نہیں آج سے دس پندرہ سال قبل ملاّ صاحب نے انجمن ترقی اردو (ہند) کی ایک کل ہند اردو کانفرنس میں خطبۂ صدارت دیتے ہوئے کہا تھا کہ" اردو میری مادری زبان ہے۔ میں مذہب بدل سکتا ہوں، مادری زبان نہیں۔"

اردو کے نام کے عنوان سے ملاّ صاحب کا یہ قطعہ ملاحظہ ہو۔

اک موت کا جشن بھی منا لیں تو چلیں
پھر پونچھ کے اشک مسکرا لیں تو چلیں
آ تجھ کو گلے لگا کے مٹتی اُردو
اک آخری گیت اور گا لیں تو چلیں

آخر میں ملا صاحب کے چند ایسے اشعار ملاحظہ ہوں، جو اہلِ ذوق کے ذہنوں میں محفوظ ہیں۔

اک ہنسی تو وہ جو ہے اشکوں سے وقتی سا فرار
اک ہنسی ہے، انتہائے غم پہ آجانے کا نام

ہم نے کبھی کی تھیں کوششیں ہم نہ تمہیں بھلا سکے
کوئی کمی ہمیں میں تھی، یاد تمہیں نہ آ سکے

وہ اگر خوش بھی ہے، عرفانِ خوشی اس کو نہیں
جس نے جانا نہ کسی غم میں پریشاں ہونا

نہیں میں پیار کے قابل، تو مجھ کو پیار نہ کر
مگر نگاہِ ترحم سے شرمسار نہ کر

آئے ہو کیا تمہی، مجھے آواز دو ذرا
آنکھوں کا نور چھین لیا انتظار نے

یہ کہہ کے آخرِ شب شمع ہو گئی خاموش
کسی کی زندگی لینے سے زندگی نہ ملی

نگاہ دوست کو اس کی بھی ہے خبر لیکن
وہ راز جس کا ابھی دل بھی راز دار نہیں

مجھے کر کے چپ کوئی کہتا ہے ہنس کر
انھیں بات کرنے کی عادت نہیں ہے

ساتھ ہو کوئی تو کچھ تسکین سی پاتا ہوں میں
تیرے آگے جا کے تنہا اور گھبراتا ہوں میں

اک سلام، اک مسکراہٹ، اک سوال، اک شکریہ
وہ بھی یونہیں راہ میں آتے ہوئے جاتے ہوئے

تیوری چڑھا کے پہلے تو کہنے دیا نہ کچھ
پھر مسکرا کے دل سے شکایت بھی چھین لی

اردو شاعری میں ملا صاحب کی آواز منفرد ہے۔ ان کی آواز ماضی کی صدائے بازگشت، حال کا رزمیہ اور مستقبل کی نقیب ہے۔ انھوں نے شاعری میں اپنے عہد کے سیاسی اور سماجی مسائل کے حل کا کوئی نسخہ پیش نہیں کیا ہے، اس لیے کہ یہ شاعر کا منصب نہیں ہے۔ بڑے شاعر کا کام سماج کی صحیح صورتِ حال کو سامنے لانا اور انسانیت کو ایسے خطرات سے آگاہ کرنا ہے، جو اسے لاحق ہو سکتے ہیں۔ باقی ان کا جو فرض ہے وہ اہلِ سیاست جانیں" یہ وہ چیز ہے جو ہنگامی اور دائمی ادب کے بیچ ایک خطِ فاصل کھینچتی ہے۔ ملا صاحب کو جو چیز زندہ رکھے گی وہ یہ نہیں کہ ان کی ہمدردیاں کون سی سیاسی پارٹی کے ساتھ ہیں یا وہ ادب کی کون سی تحریک سے متاثر ہوئے ہیں، بلکہ یہ کہ انھوں نے زندگی اور اس کے مسائل کے بارے میں کیسے سوچا اور کس طرح اپنی شاعری میں اس سوچ کو سمویا۔ اس اعتبار سے ہمیں شاعر آنند نرائن ملا ایک منفرد اور توانا شخصیت نظر آتے ہیں۔

ایم ۔ حبیب خاں

مُلّا صاحب کی اُردو خدمات

ملّا صاحب ۲۴ر اکتوبر ۱۹۰۱ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے والد کا نام جگت نرائن ملّا تھا جو لکھنؤ کے مشہور وکیلوں میں تھے اور لکھنؤ کی اہم شخصیت تھے ۔ اردو فارسی کی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ ۱۹۲۳ء میں انگریزی میں ایم ۔اے کیا اور ۱۹۲۵ء میں وکالت کا امتحان پاس کر کے لکھنؤ ہی میں وکالت شروع کر دی ۔ ملّا صاحب نے انگریزی میں شاعری ۱۹۱۷ء میں شروع کی ۔ طالب علمی کے زمانے میں انیسؔ ، غالبؔ اور اقبالؔ کے اشعار کے اردو میں ترجمے کیے ۔ اس طرح عالمی ادب سے واقفیت کا موقع ملا ۔

ملّا صاحب لکھنوی تہذیب کے دلدادہ ہیں، اردو ان کی مادری زبان ہے ۔ ۱۹۲۵ء میں اردو میں شاعری کی ابتدا کی اور اردو میں سات کتابیں لکھیں جن میں جوئے شیر ، میری حدیث عمر گریزاں ، کچھ ذرّے کچھ تارے ، کرب آگہی ، جادۂ ملّا ۔ پانچ شعری مجموعے ، ایک نثر میں اور ایک مضامین نہرو کا اردو ترجمہ ہے ۔ شاعری میں کسی کے شاگرد نہیں ہیں نہ کسی سے اصلاح لی البتہ چکبست لکھنوی کی شاعری سے متاثر نظر آتے ہیں ۔ ملّا صاحب کی زندگی کا بیشتر حصّہ لکھنؤ میں گزرا ۔

ملّا صاحب الٰہ آباد ہائی کورٹ کے جج اکتوبر ۱۹۶۱ء تک رہے ۔ سرکاری ملازمت سے آزاد ہونے کے بعد انھوں نے اردو کے فروغ اور اس کو سرکاری حیثیت دلانے کی طرف توجہ کی ۔ تقسیم ہند کے بعد اردو کے ساتھ جو برتاؤ ہوا اس سے انھیں ذہنی تکلیف پہنچی ملک میں تنگ نظری کی فضا چاروں طرف پھیل چکی تھی اور حکومت کی بے انصافی سے ان کے درد مند دل کو بڑی ٹھیس پہنچی ۔ ملّا صاحب نے سخت سے سخت حالات میں بھی اپنا چراغ روشن رکھا ہے اور تہذیب کی امانت کی ہے ۔ ان کی وضعداری ان کی تہذیبی روایات کی آئینہ دار ہے ۔ تقسیم ہند کے بعد سے اردو کے ساتھ حکومت کی بے انصافی کی طرف انجمن ترقی اردو شروع ہی سے کانفرنسوں کے ذریعہ توجہ دلاتی رہی ہے ۔ ۳،۲ اور ۴ر اکتوبر ۱۹۶۴ء کو جے پور میں انجمن کی چوتھی آل انڈیا اردو کانفرنس منعقد ہوئی

اس وقت موہن لال سکھاڈیا راجستھان کے چیف منسٹر تھے۔ کانفرنس کا افتتاح وزیراعلا ہی نے کیا تھا اور ملّا صاحب نے کانفرنس کی صدارت فرمائی تھی۔ اس وقت انجمن کے اعزازی جنرل سکریٹری پروفیسر آل احمد سرور تھے۔ اس کانفرنس میں انجمن کی تمام شاخوں کے عہدے دار، نمائندے، اردو کے ادیب شاعر اور اردو سے محبت کرنے والوں نے شرکت کی تھی۔ جے پور کے مسلم مسافر خانے کے وسیع میدان میں بڑا بھاری اجتماع ہوا۔ اس لق و دق میدان میں اردو کے ہر فرقے کے لوگ موجود تھے۔ اسی وسیع میدان میں اردو بازار بھی لگایا گیا تھا۔ جہاں ہندوستان بھر سے اردو کے پبلشروں اور بک سیلروں نے شرکت کی تھی۔ انجمن کی طرف سے پروفیسر آل احمد سرور، محمد حفیظ الدین مرحوم نائب معتمد انجمن اور راقم نے شرکت کی تھی۔ اس میں انجمن ترقی اردو (ہند) کی مجلس عام کے تمام ممبران کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ میں نے آج تک اتنا بڑا اردو کا مجمع نہیں دیکھا یہیں پہلی بار ملّا صاحب، سکندر علی وجد اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ سے ملاقات ہوئی۔ اردو کتابوں کی بھاری خریداری کا جذبہ پہلی بار یہیں دیکھنے میں آیا۔

راجستھان کے چیف منسٹر موہن لال سکھاڈیا نے بڑی شستہ اور آسان زبان میں اردو میں تقریر کی۔ راجستھان کی صوبائی شاخ کے صدر الطاف احمد خیری صاحب تھے اور سکریٹری مولوی احترام الدین احمد شاغل عثمانی مرحوم تھے۔ ان دونوں حضرات کی کوششوں کی وجہ سے جے پور کی یہ کانفرنس انجمن کی کامیاب ترین کانفرنسوں میں شمار کی جاتی ہے۔ ملّا صاحب نے اسی کانفرنس میں کانگرس پارٹی کے برسراقتدار ذمے داروں کو اردو کی بے انصافی کی طرف توجہ دلائی تھی اور بڑی جرأت کے ساتھ اردو کے متعلق فرمایا تھا:

"میرے ایسے غیر مذہبی آدمی کے لیے زبان مذہب سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ میں مذہب چھوڑ سکتا ہوں لیکن زبان نہیں چھوڑ سکتا۔ کیوں کہ زبان میری ذات کا آئینہ ہے۔ میری میراث ہے میری تاریخ ہے، میری زندگی ہے۔"

یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جسے اردو سے والہانہ عشق ہو۔ والہانہ عشق تو منشی ہرگوپال تفتہ، سحر عشق آبادی (بھگوان چندر بھٹناگر)، منشی جگن ناتھ پرشاد خوشتر، پنڈت گنگا پرشاد کشمیری رند، چکبست لکھنوی، پنڈت دیا شنکر نسیم، حکیم برج لال خمار، پنڈت کشن پرشاد کول، تلوک چند محروم، جوش ملسیانی ہوش ملسیانی اور پنڈت دتاتریہ کیفی وغیرہ کو بھی تھا۔ یہ اردو زبان کے وہ ہندو ادیب اور شاعر ہوئے ہیں جن

کا اردو زبان کی ترقی میں خاص حصہ رہا ہے اور اس طرح کے اور بھی بہت سے نام ہیں۔ لیکن انھوں نے اردو زبان میں جو کچھ لکھا یا اس کی خدمت کی تو کوئی تعجب کی بات نہیں، کیوں کہ انگریزی حکومت کے شروع میں فارسی زبان کا غلبہ اور بعد میں اردو کا چلن عام ہوگیا تھا۔ اس لیے انگریزی حکومت نے اردو کو سرکاری زبان قرار دے دیا۔ سوال تو ۱۹۴۷ء کے بعد کا ہے جب ہندوستان آزاد ہوا اور جس زبان میں اردو کا نعرہ 'انقلاب زندہ باد' لگایا گیا۔ آزادی ملنے کے بعد حکومت نے اس زبان کے ساتھ جو بے انصافی برتی وہ آج تک چلی آرہی ہے۔ اس ماحول میں رہ کر ملّا صاحب نے اردو کے بارے میں آواز اٹھائی اور مذہب چھوڑنے کی بات بڑی دلیری اور جرأت کے ساتھ بھاری مجمع میں کہی، اردو کا کوئی بھی حامی اسے فراموش نہیں کرسکتا ہے۔ بقول پروفیسر مسعود حسین صاحب "کوئی مائی کالال ایسا ہے جس نے اتنی جرأت اور دلیری کے ساتھ یہ کہا ہو کہ میں 'مذہب چھوڑ سکتا ہوں لیکن زبان نہیں چھوڑ سکتا'۔" یہ بات ہر ادیب یا شاعر کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ یہ اردو سے ان کے قلبی لگاؤ کی دلیل ہے۔ اگر دوسرے ہندو ادیب اور شاعر ملّا صاحب کے ساتھ اردو کے حق میں آواز اٹھاتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان نہ بنایا جاتا اور مذہب کے نام پر جو جھگڑے آئے دن ہوتے رہتے ہیں کبھی نہ ہوتے۔

میں نے بہت سے ہندو ادیبوں اور شاعروں کا مطالعہ کیا ہے جنھوں نے اردو کی بدولت اعلا مقام حاصل کیا ہے لیکن انھوں نے مردم شماری کے موقع پر اپنی مادری زبان اردو کے بجائے ہندی درج کرائی اور کراتے ہیں۔ لیکن ملّا صاحب کے بارے میں یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی مادری زبان اردو ہی درج کراتے ہیں۔ ملّا صاحب کے علاوہ دو چار ہندو ادیب اور ایسے ہیں جو اپنی مادری زبان اردو درج کراتے ہیں۔ ملّا صاحب نے اس کے بارے میں اردو کی کئی محفلوں میں اس کا اعتراف کیا ہے۔ اردو والوں کے لیے یہ بڑے فخر کی بات ہے۔

اردو تحریک اور ملّا صاحب دو الگ الگ نام نہیں ہیں۔ انھوں نے اردو کے مقدمے کو جس دلیری اور جرأت کے ساتھ پیش کیا وہ ان کی اردو شناسی کی بہترین مثال ہے۔

غرض ملّا صاحب زندگی بھر اردو کی خدمت کرتے رہے اور اب بھی اس نوے برس کی عمر میں ان کی خدمت کا سلسلہ جاری ہے۔ ان کا یہ فقرہ ایسا مشہور ہوا کہ تیس سال گزرنے کے بعد بھی اس میں وہی تڑپ تازگی اور زندہ دلی ہے جو تیس سال پہلے تھی۔

۱۹۶۶ء میں جامعہ اردو علی گڑھ کے پرو چانسلر بنائے گئے اور تقریباً سات سال تک جامعہ اردو سے وابستہ رہے۔

۱۹۶۸ء میں ساہتیہ اکیڈمی دلّی کے اردو مشاورتی بورڈ کے رکن مقرر ہوئے۔

۱۸ جنوری ۱۹۷۲ء کو اتر پردیش میں اردو اکاڈمی قایم ہوئی۔ اکاڈمی کے صدر اس وقت کے وزیر اعلا مقرر ہوئے اور انتظامیہ کے صدر پنڈت آنند نرائن ملّا بنائے گئے۔ اور اس عہدے پر رہ کر ملّا صاحب نے اردو کی بڑی خدمت کی۔

۹ اکتوبر ۱۹۷۲ء کو انجمن کے نئے عہدے داروں کے انتخابات کے سلسلے میں مجلس عاملہ کا ایک جلسہ ہیرو ہاؤس نئی دلّی میں منعقد ہوا۔ اس میں ملّا صاحب انجمن کے صدر منتخب ہوئے۔ نائب صدور میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں مرحوم اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ منتخب ہوئے۔ اس وقت انجمن کے قایم مقام اعزازی سکریٹری پروفیسر مسعود حسین صاحب تھے۔ اس زمانے میں سرور صاحب حکومت ہند کی وزارتِ تعلیم کی دعوت پر رومانیہ، ہنگری اور سوویت یونین کے دورے پر گئے ہوئے تھے۔

۲۴ اکتوبر کے ہماری زبان میں مسعود صاحب نے ملّا صاحب کے بارے میں اپنے اداریے میں لکھا تھا:

"اردو دنیا میں یہ تینوں نام جانے پہچانے ہیں۔ ملّا صاحب کا شمار صفِ اوّل کے شعراء میں ہوتا ہے۔ وہ اردو کے مجاہد اور سپاہی بھی رہے ہیں۔ اردو کی محبّت میں ان کا جے پور کی کانفرنس میں یہ کہنا کہ میں مذہب چھوڑ سکتا ہوں لیکن اپنی زبان نہیں چھوڑ سکتا" اب یہ کلاسیکی جملے کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔"

ملّا صاحب سے پہلے انجمن کے صدر پنڈت ہردے ناتھ کنزرو تھے جو دس برس تک اس عہدے پر رہے۔ ان کے زمانے میں ملّا صاحب انجمن کے نائب صدر پانچ سال تک رہے۔ مسعود صاحب نے سابق صدر کنزرو صاحب کی خدمات کو بھی سراہا۔ ملّا صاحب انجمن کے صدر دس سال یعنی ۱۹۸۲ء تک رہے۔

ملّا صاحب کی خدمات کے اعتراف میں حکومت اتر پردیش نے ۱۹۵۹ء میں غالب انعام سے نوازا۔ ۱۹۶۴ء میں ساہتیہ اکیڈمی انعام ملا۔ ۱۹۸۰ء میں ذوق ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے اور ۱۹۸۹ء میں فخر الدین علی احمد انعام سے نوازا گیا۔

ملّا صاحب اردو کے ممتاز شاعر ہیں اور اپنی شاعری کے ذریعہ اردو کی بڑی خدمت کی ہے۔ پروفیسر آل احمد سرورؔ "جوئے شیر" کے دیباچے میں ملّا صاحب کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں :

"ملّا ان شاعروں میں سے ہیں جو نظم اور غزل دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ ان کے دل کی دولت نذرِ خوباں بھی ہے اور نذرِ دوراں بھی۔ ان کی غزلوں میں ایک تازگی، تفکّر اور جذب لطافت ملتی ہے۔"

ڈاکٹر خلیق انجم نے ملّا صاحب کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے جادۂ ملّا کے پیش لفظ میں ایک جگہ لکھا ہے :

"ملّا صاحب کی شاعری کا بڑا حصّہ محض جذبے اور احساس کی ترجمانی نہیں بلکہ ایک دردمند دل رکھنے والے دانشور کا فکری اظہار بھی ہے۔ وہ ایسی دنیا اور ایک ایسے سماجی نظام کے متلاشی ہیں جس میں انسان سکون و آرام کی زندگی گزار سکے جہاں اس کا جسم اور دماغ کسی طاقت ظلم، جبر اور استبداد کا شکار نہ ہو اور جہاں . . . اس کے اظہار کے پیروں میں بیڑیاں نہ ڈالی جائیں۔"

ملّا صاحب نے غزل اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی شاعری ان کے کردار اور سیرت کی آئینہ دار ہے۔ ان کی شاعری میں جذبے اور کیفیت کی ترجمانی ملتی ہے۔ وہ وہی کہتے ہیں جو محسوس کرتے ہیں۔ درد و لولہ اور اثر ان کے کلام کی خاص خصوصیتیں ہیں۔

ملّا صاحب نے زندگی کا مطالعہ گہری نظر سے کیا ہے۔ ان کا ہر خیال فکر کی کسوٹی پر کسا ہوا ہوتا ہے، جس میں خلوص اور سچّائی شامل ہوتی ہے۔ یہی جذبات ان کی شاعری کو رنگیں بناتے ہیں۔ انھوں نے اپنی غزل کے ایک شعر میں اپنے فنی رجحان کی ترجمانی اس طرح کی ہے۔ ؎

اظہار دردِ دل کا تھا اک نام شاعری
یارانِ بے خبر نے اسے فن بنا دیا

تقسیم ہند کے بعد اُردو کے ساتھ جو بے انصافی ہوئی ان کا دردمند دل تڑپ اٹھا۔ ایک قطعے میں اس کا اِظہار کس قدر درد بھرے الفاظ میں کیا ہے۔ ؎

اِک موت کا جشن بھی منا لیں تو چلیں
پھر پونچھ کے اشک مُسکرالیں تو چلیں
آ تجھ کو گلے لگا کے مٹی اردو
اِک آخری گیت اور گالیں تو چلیں

ملّا صاحب پر یہ سمینار ان کے ۹۰ سال پورے ہونے پر منعقد کیا گیا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ انسانیت کے علَم بردار کی سوویں سال گرہ اس اردو گھر میں اس سے بھی شاندار طریقے پر منائی جائے۔ اس شعر کے ساتھ میں اپنا مقالہ ختم کرتا ہوں۔

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

شمیم جہاں

مُلاّ صاحب سے ایک ملاقات

اردو تحریک کے روحِ رواں، سفیرِ اردو پنڈت آنند نرائن ملاّ، اردو کے مشہور و معروف شاعر اور نثر نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے انگریزی میں ایم۔ اے کیا اور شاعری کا آغاز بھی انگریزی شاعری سے کیا۔ انگریزی ادب سے انھیں گہری دلچسپی رہی۔ لیکن اِس کے باوجود ملاّ صاحب نے اردو کا چراغ ہمیشہ اپنے دل میں جلائے رکھا۔ اردو کے قافلۂ سالار کی حیثیت سے ان کے ہاتھوں میں ہمیشہ اردو کا عَلَم رہا اور ان کے ہاتھ کبھی نہیں جھکے۔ یہی وجہ ہے کہ ملاّ صاحب کا نام اردو دنیا میں انتہائی عقیدت اور احترام سے لیا جاتا ہے۔

پنڈت آنند نرائن ملاّ کا جنم ۲۴ اکتوبر ۱۹۰۱ء میں لکھنؤ میں ہوا۔ ۱۹۲۳ء میں ایم۔ اے کیا اور ۱۹۲۵ء میں وکالت پاس کی اور لکھنؤ ہی میں پریکٹس شروع کردی۔ ۱۹۵۴ء میں الہ آباد ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ بہ حیثیتِ جج ۲۴ اکتوبر ۱۹۶۱ء تک کسی قسم کا بیرونی دباؤ قبول کیے بغیر لوگوں کو انصاف دیا۔ اور اب ان کا شمار سپریم کورٹ کے کامیاب ترین وکیلوں میں ہے۔

۱۹۷۵ء میں جب میں انجمن میں آئی، اس وقت ملاّ صاحب انجمن ترقی اردو کے صدر تھے۔ ملاّ صاحب کا نام میں نے انجمن میں آنے کے بعد ہی سُنا۔ پنڈت اور ملاّ۔ ان دو لفظوں نے مجھے کافی دنوں تک الجھائے رکھا۔ اِسی نام کی وجہ سے مجھے ملاّ صاحب کو دیکھنے کی شدید خواہش پیدا ہوگئی۔ جب ملاّ صاحب کا ذکر ہوتا، تو کبھی ملاّ صاحب، ملاّ کے مخصوص لباس میں میرے تصور میں ہوتے اور کبھی ٹھیٹ پنڈت کے دستروں میں گلے میں جنیؤ پہنے۔ بہرحال میری یہ اُلجھن جلد ہی دور ہوگئی۔ جب ۱۹۷۶ء میں انجمن کی مجلسِ عاملہ کے جلسے میں ملاّ صاحب تشریف لائے اور مجھے ان سے ملنے اور انھیں دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ منظر بالکل اُلٹا تھا۔ نہ وہ ملاّ تھے، نہ پنڈت۔ نہایت معقول، وجیہہ اور متاثر کردینے والی بزرگ شخصیت میرے سامنے تھی۔ اس کے بعد ملاّ صاحب جب بھی اردو گھر میں تشریف لاتے تو میں انھیں سلام

کرتی اور موقع ملتا تو ایک دو بات بھی کرتی۔ کیوں کہ ان سے باتیں کر کے مجھے اچھا لگتا تھا۔ ملّا صاحب واقعی ایسی شخصیت ہیں، جن کا احترام کرنے کو دل چاہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میری بڑی خواہش تھی کہ میں ملّا صاحب کے پاس بیٹھوں۔ ان کی باتیں سنوں۔ اگرچہ بارہا ان کے دولت خانے پر جانے کا اتفاق ہوا۔ لیکن سلام دعا اور رسمی بات چیت کے علاوہ ان سے تفصیلی گفتگو کا موقع نہ ملا۔ اب جب کہ انجمن ترقی اردو (ہند) اور جامعہ اردو علی گڑھ، ملّا صاحب کا جشن سالگرہ منا رہے ہیں۔ اس مبارک موقع پر میرا دل چاہا کہ میں بھی ان کی شخصیت پر کچھ لکھوں، ان سے گفتگو کی روشنی میں ــــ لیکن ڈر یہی تھی کہ ملّا صاحب اپنی کمزور صحت اور مصروفیات کے پیش نظر وقت دینے سے انکار نہ کر دیں۔ بہر حال ہمتِ مرداں مددِ خدا پر یقین کیا اور ملّا صاحب کو فون ملایا۔ زہے نصیب! کہ وقت مل گیا۔ انھوں نے فرمایا آپ ۴ (چار) بجے آجائیے۔ میں ٹھیک چار بجے ملّا صاحب کے یہاں پہنچ گئی۔

ملّا صاحب اپنی وسیع کوٹھی کے وسیع برآمدے میں کرسی پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے یا شاید میرا ہی انتظار کر رہے ہوں۔ ملّا صاحب کافی ہشاش بشاش نظر آرہے تھے۔ سلام دعا کے بعد میں نے اپنے آنے کی وجہ بیان کی، کہنے لگے "اچھا آپ میرا انٹرویو لینے آئی ہیں . . . کیا خلیق انجم نے آپ کا نام بھی شامل کیا ہے، مقالہ نگاروں میں" میں نے عرض کیا، جی ہاں! یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میرا نام بھی اس فہرست میں ہے۔

ملّا صاحب کے ساتھ گفتگو کے ان لمحات کو میں نے صفحات میں قید کر لیا۔ آئیے اُن لمحات کی بازگشت سنیں۔ میرا پہلا سوال ان کی شاعری کے بارے میں تھا۔

آپ نے اردو شاعری کا آغاز کب کیا؟

ملّا صاحب :۔ انگریزی میں شاعری تو میں ۱۹۱۸ء سے کر رہا ہوں، جب میں بی۔ اے میں تھا۔ اردو شاعری کا آغاز بہت بعد میں ہوا۔ غالباً ۱۹۲۵ء میں۔

سوال :۔ لکھنؤ کی سرزمین شاعری کے لیے بڑی زرخیز اور شاعروں کو بہت راس آئی ہے کیا آپ بھی لکھنؤ کے شعر و سخن کے ماحول سے متاثر ہوئے؟

مُلّا صاحب :۔ "یہ درست ہے، ماحول کا اثر یقیناً ہوتا ہے، مجھ پر بھی ہوا ہوگا۔ میں اکثر ادبی نشستوں اور مشاعروں میں شریک ہوتا تھا۔

سوال :- آپ کی پہلی غزل یا نظم کونسی ہے ؟

ملا صاحب :- میں نے روایت سے ہٹ کر اپنی شاعری نظم سے شروع کی ۔ میری پہلی نظم "پرستارِ حسن" ہے، جو مسدس کے فارم میں ہے ۔ دس بارہ بند پر مشتمل ہے ۔

سوال :- شاعری میں آپ کا لہجہ منفرد ہے اور یہ کہ آپ کی شاعری کسی فرد واحد کی آواز نہیں ہے ۔ بلکہ یہ تمام عالم انسانیت کی آواز ہے، جس میں مذہب پر انسانیت کو فوقیت حاصل ہے اور انسان دوستی کا جو جذبہ اور اس جذبے میں جو خلوص و صداقت آپ کے یہاں ہے، کیا اس کے پیچھے کوئی تجربہ، مشاہدہ یا تحریک ہے یا یہ محض ایک نظریہ کے طور پر آپ کے یہاں ہے ؟

اس ضمن میں مجھے آپ کا ایک شعر یاد آگیا ۔

مجھے مذہب مٹانا ہی پڑے گا روئے ہستی سے
ترے ہاتھوں، بہت توہینِ آدم ہوتی جاتی ہے

مُلا صاحب :- یہ سوال مشاہدے یا تجربے کا نہیں ہے ۔ یہ ایک نظریہ ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ انسان دوستی کل کے لیے اور کل کے بعد کے لیے ہے ۔ نوعِ انسان کی ترقی میں، انسان دوستی ہی مددگار ہوتی ہے ورنہ ہم کسی وقت بھی فنا ہو سکتے ہیں ——— مجھے ایک شعر یاد آیا سناتا ہوں ۔

مجھے اے خالقِ کون و مکاں خاموش کر دینا
مرے لب پر نہ جس دن دردِ انساں کی پکار آئے

سوال :- آپ اردو تحریک کے سرگرم رُکن ہیں اور آپ کا نام اُردو تحریک میں سرِفہرست ہے ۔ تحریک کے سلسلے میں آپ کی کیا سرگرمیاں رہی ہیں ؟

مُلا صاحب :- یہ تو لوگوں کی محبت ہے جو مجھے اتنا بڑا درجہ دیا ۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کوئی ایسا بڑا کارنامہ انجام دیا ہو ۔ ہاں اردو کے جائز حقوق کے لیے میں نے ہمیشہ آواز اٹھائی ہے ۔ بہت سے میمورنڈم حکومت کو پیش کیے خطبات دیئے ۔ میں نے خود کو ہمیشہ اردو کا خادم سمجھا ہے ۔ اور میں اِسے اپنا حق

سمجھتا ہوں، اور یہ حق زائل نہ ہونے پائے اس کی پوری کوشش کرتا ہوں، کیوں کہ ملک کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ زبان کی حفاظت کی جائے۔ میں نے قومی حکمت کے طور پر اردو کی خدمت کی ہے، جو بھی میں کر سکا۔"

سوال :- ملا صاحب! یہ حقیقت ہے کہ اردو کے معاملے میں آپ زیادہ حساس ہیں اور آپ کا رویہ دوسروں سے الگ ہے۔ تقسیم ملک کے بعد اردو کو محدود کر کے ایک فرقے کی زبان قرار دے دیا گیا اور اس کی ترقی کی تمام راہیں مسدود کر دی گئیں۔ لیکن اس کے باوجود آپ اپنے موقف پر ڈٹے رہے اور تحریک کے محاذ سے اردو کی جنگ لڑتے رہے؟

آپ کا یہ فقرہ (جواب تاریخی حیثیت اختیار کر گیا ہے) "میں مذہب بدل سکتا ہوں، زبان نہیں بدل سکتا"۔ یہ اردو سے آپ کی بے پناہ محبت کا اظہار ہے۔ اس سلسلے میں آپ کچھ کہنا چاہیں گے۔

ملا صاحب نے بہت جذباتی انداز میں کہا :-

جی ہاں میں نے یہ فقرہ جامعہ اردو کے ایک جلسے کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا، اور کچھ جملے بھی کہے تھے۔ "اردو میری میراث ہے، اردو میں ہوں" وغیرہ وغیرہ۔ جہاں تک اردو سے محبت کا سوال ہے، آپ دیکھ رہی ہیں کہ میرا نیچر ایمان میں بلیور (Blieve) نہیں کرتا ہے۔ انسان میں بلیو (Blieve) کرتا ہے۔ انسانی قدریں جو ہیں، ان کی حفاظت ضروری ہے۔ اور ادبی زبان ایک ایسی انسانی قدر ہے جس کے بغیر انسان ترقی نہیں کر سکتا۔ اگر وہ اپنی مادری زبان نہیں جانتا۔ اور گویا ہم اس کو نکال دیتے ہیں کہ تم سارے مقابلے میں نیچے درجے پر رہو اور یہ میں کیسے قبول کر سکتا ہوں اور کوئی کیسے قبول کر سکتا ہے، جو انسانیت میں یقین رکھتا ہے۔ اردو کے ساتھ محبت میرا آئینی حق ہے۔ اور انسانی حق بھی ہے۔ اسی وجہ سے اردو کی جو بھی خدمت میں کر سکا میں نے کی۔"

سوال :- ملا صاحب! آپ سیاست سے کب وابستہ ہوئے؟

ملاّ صاحب :- میں سیاست سے کبھی وابستہ نہیں ہوا۔

سوال :- لیکن آپ ممبر پارلیمنٹ ہیں آپ نے کبھی اردو کا سوال پارلیمنٹ میں اٹھایا؟

ملا صاحب :- پارلیمنٹ میں اردو کا سوال کبھی نہیں اٹھایا لیکن جب اردو کے لیے پارلیمنٹری کمیٹی بنی تو میں اس کا صدر تھا۔ ممبر پارلیمنٹ ہونا یہ لوگوں کے دلوں میں میری شخصی محبت کا نتیجہ تھی۔ میں ان ڈیپنڈنٹ کینڈیڈیٹ کی حیثیت سے ۱۹۶۷ء میں لوک سبھا کے لیے لکھنو کے پارلیمنٹری الیکشن میں منتخب ہوکر آیا اور عوام نے مجھے ان لوگوں کے مقابلے میں پسند کیا جو کسی سیاسی گروہ سے وابستہ تھے۔ میری انسانی قدروں کی وجہ سے لوگوں کا مجھ میں اعتماد تھا۔ میں نے انسانی قدروں پر عمل کیا ہے، زندگی میں پیشے میں، ادب میں اور قانون میں، فقط زبان سے ہی نہیں کیا ہے۔

سوال :- آپ راجیہ سبھا کے ممبر کب نامزد ہوئے ؟

ملاّ صاحب :- میں ۱۹۶۷ء میں لوک سبھا میں آیا اور ۱۹۷۰ء میں وہ ہاؤس ختم کر دیا گیا۔ ۱۹۷۰ء میں دوبارہ الیکشن ہوئے لیکن کانگریس نے مجھے نامزد نہیں کیا۔ اس وقت کانگریس کا اتنا زور تھا کہ میں سمجھتا تھا کہ میں جیت نہیں پاؤں گا۔ اس لیے ۱۹۷۰ء میں میں نے الیکشن نہیں لڑا۔ لیکن ۱۹۷۲ء میں کانگریس نے مجھے خود نامزد کیا ۱۹۷۸ء تک میں راجیہ سبھا کا ممبر رہا۔"

سوال :- تو کیا اس سے پہلے کانگریس سے آپ کا قطعی تعلق نہیں تھا ؟

ملاّ صاحب :- کانگریس تو بچپن سے میرے ساتھ تھی، جب میں ۱۶ برس کا تھا۔ لکھنؤ میں کانگریس کا اجلاس ہوا، میرے والد ریسپشن کمیٹی کے چیرمین تھے۔ میں ان کا پیش تھا۔ لیکن میں نے کانگریس سے کبھی کوئی سوال نہیں کیا اور نہ ہی کانگریس نے مجھے قریب لانے کی کوشش کی۔ لیکن میں عوام میں مقبول ہو چکا تھا۔ میں لوک سبھا میں آیا اور ثابت کیا کہ میں، مَیں ہوں۔

سوال :- آپ کبھی پاکستان تشریف لے گئے ؟

ملاّ صاحب :- میں ۱۹۵۲ء میں ٹربیونل کا چیرمین ہوکر پاکستان گیا۔ وہاں میری بڑی قدر

ہوئی۔اس زمانے میں شوکت تھانوی وغیرہ تھے۔ مجھے پاکستان میں "سفیر اردو" کا خطاب دیا گیا لیکن یہاں تو مجھے کوئی خطاب کسی نے نہیں دیا، لیکن پاکستان نے دیا۔

(ملا صاحب کے لہجے میں، میں نے ایک شکایت محسوس کی جو ہر اس انسان کو ہوتی ہے۔ جو (   ) کرتا ہے اور اُسے نہیں ملتا) چائے آگئی اور گفتگو کا سلسلہ تھوڑی دیر کے لیے رک گیا۔ چائے کے بعد گفتگو کے سلسلے کی کڑیاں جوڑتے ہوئے میں نے ملا صاحب سے پوچھا۔

سوال :۔ کیا اب بھی شاعری اور لکھنے کا سلسلہ جاری ہے؟

ملا صاحب :۔ اب شاعری بھی چودہ، پندرہ سال سے غائب ہے اور نثر بھی غائب ہے لیکن کبھی کوئی اپنی کتاب کے مقدمے کے طور پر لکھوانے آجائے تو لکھ دیتا ہوں۔ ابھی رفعت سروش تشریف لائے تھے، اسی سلسلے میں۔

سوال :۔ کیا وکیل آپ کو والدین کی خواہش کی وجہ سے بننا پڑا یا آپ نے اپنی پسند سے یہ پیشہ اختیار کیا؟

ملا صاحب :۔ یہ میرا خاندانی پیشہ سمجھیے، میرے والد بھی وکیل تھے۔ ان کی وجہ سے میری طبیعت بھی اس طرف آگئی اور یہ میری روٹی کا ذریعہ بن گیا۔ میں نے آئی۔سی۔ایس کا امتحان بھی دیا تھا۔ لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ ٹوئلو کے چُنے جانے والے تھے۔ میں تیرویں نمبر پر تھا۔

سوال :۔ انجمن میں آپ کب آئے؟

ملا صاحب :۔ انجمن میں مجھے سجاد ظہیر لائے اور براہِ راست صدر کی حیثیت سے میں دس سال تک انجمن کا صدر رہا۔ دلّی میں اردو کے بہت سے ادارے ہیں لیکن انجمن سے میرا ایک رشتہ ہے، ایک تعلق ہے۔

(میں نے ملا صاحب سے کہا کہ میں کچھ ذاتی قسم کے سوالات کرنا چاہتی ہوں۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو، انھوں نے کہا، ضرور پوچھیے۔)

سوال :- جوانی میں آپ کے کیا کیا شوق تھے ؟

ملاّ صاحب :- مجھے کھیلوں میں بہت دلچسپی تھی ۔ میں اس وقت ایک اچھا سپورٹ مین مانا جاتا تھا ۔ ٹینس بہترین کھیلتا تھا ، تاش کا ہر گیم میں نے کھیلا ہے ۔ برج کا بہت اچھا کھلاڑی تھا ، پوکر کھیلتا تھا ۔ کلب کا سکریٹری ہوا کرتا تھا ، مشاعروں اور ادبی نشستوں میں شرکت کا بڑا شوق تھا ۔

سوال :- کھانے میں آپ کیا پسند کرتے تھے اور اب کیا پسند کرتے ہیں ؟

ملاّ صاحب :- جوانی میں مرغن کھانے مجھے بہت پسند تھے خوب کھاتا تھا اور اب سادہ کھانا کھاتا ہوں کیوں کہ مرغن کھایا نہیں جاتا ۔

سوال :- (ایک بہت نجی سوال معذرت کے ساتھ کر رہی ہوں) کیا آپ کی ازدواجی زندگی میں کبھی کوئی اتار چڑھاؤ آیا ، آپ کے اور بیگم صاحبہ کے خیالات میں کبھی اختلاف ہوا ؟

ملاّ صاحب :- مجھے یاد نہیں کہ کبھی میری اور بیگم صاحبہ کی پسند میں یا خیالات میں اختلاف ہوا ہو ۔

سوال :- ملاّ صاحب ! جو لباس آپ پہنتے ہیں اس میں بیگم صاحبہ کی پسند بھی شامل ہے یا آپ اپنی پسند کے کپڑے پہنتے ہیں ۔

ملاّ صاحب :- میں نے ہمیشہ وہی کپڑے پہنے ہیں جو کشمیری مرد پہنتے تھے ، شیروانی ، پاجامہ ۔ کبھی سوٹ نہیں پہنا ، لیکن بیگم صاحبہ نے کبھی ناپسند نہیں کیا ۔

سوال :- آج کل آپ کے شب و روز کیسے گزرتے ہیں ؟

ملاّ صاحب :- بھئی جب سے میری ٹانگیں ٹوٹ گئیں ہیں ۔ سونٹا لے کر چلتا ہوں ۔ نظر بھی کمزور ہو گئی ہے ۔ اس لیے صبح کی سیر کو بھی بہت کم جاتا ہوں ، اب پڑھتا بھی نہیں ہوں جو کتابیں آتی ہیں میں دے دیتا ہوں ۔ دو کتابیں ساہتیہ اکیڈمی سے آئی ہیں وہ آپ کو دوں گا ۔

اب تو بس وکالت کرتا ہوں ۔ عدالت میں بحث کرتا ہوں ۔ بحث کی تیاری کرتا ہوں ۔ اب میں اردو کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا ۔ اس قابل اب نہیں سمجھتا خود کو ۔

سوال :- صبح کتنے بجے اٹھتے ہیں ؟

ملا صاحب :- ۶ بجے اٹھ جاتا ہوں۔ ساڑھے آٹھ تک ضروریات سے فارغ ہوکر بریک فاسٹ لیتا ہوں . . . . بریک فاسٹ میں کیا لیتے ہیں ؟ دلیا، پاپڑی، چیز وغیرہ نو بجے تک عدالت چلا جاتا ہوں۔ لنچ گھر پر ایک بجے لیتا ہوں۔ آرام کرکے چار بجے چائے پیتا ہوں چائے کے ساتھ کیلا، پپیتا یا کوئی اور پھل۔ رات کو آٹھ بجے ڈنر کھاتا ہوں۔ ہندی کی نیوز سنتا ہوں اور پھر انگریزی کی بھی نیوز سنتا ہوں۔ ساڑھے نو بجے بستر پر چلا جاتا ہوں۔

سوال :- ملا صاحب! بس آخری سوال۔ کیا شادی آپ نے اپنی پسند سے کی تھی یا والدین کی پسند سے ؟

ملا صاحب :- سو فیصدی اپنی پسند سے کی تھی میری بیگم کا نام اپنورنا ہے۔ کشمیری ہیں۔ اُن کے بھائی سے میری دوستی تھی، گھر میں آنا جانا تھا۔ مجھے لڑکی پسند تھی میں نے شادی کرلی۔

ملا صاحب سے گفتگو کرکے مجھے بہت لطف آیا، جو سادگی، صفائی ان کی زندگی میں ہے وہی ان کی زبان پر بھی ہے ——— اس زحمت کے لیے میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور ان کی گفتگو کے لطیف اور شیریں احساس کے ساتھ واپس آگئی۔

مرتب

○

رہروی ہے نہ رہنمائی ہے
آج دورِ شکستہ پائی ہے

عقل لے آئی زندگی کو کہاں
عشقِ ناداں، تری دہائی ہے

ہے افق در افق رہِ ہستی
ہر رسائی میں نارسائی ہے

ہوگئی گم کہاں سحر اپنی
رات جاکر بھی رات آئی ہے

جس میں احساس ہو اسیری کا
وہ رہائی، کوئی رہائی ہے

کارواں ہے خود اپنی گرد میں گم
پاؤں کی خاک سر پہ آئی ہے

عشق میں زندگی کی لَو اکثر
جھلملائی تو جگمگائی ہے

بن گئی ہے وہ التجا آنسو
جو نظر میں سما نہ پائی ہے

ہر کنارے پہ خوفِ طوفاں اور
ہر کنارے سے موج آئی ہے

برق ناحق چمن میں ہے بدنام
آگ پھولوں نے خود لگائی ہے

وہ بھی چپ ہیں خموش ہوں میں بھی
ایک نازک سی بات آئی ہے

اور کرتے ہی کیا محبت میں
جو پڑی دل پہ وہ اٹھائی ہے

مے صافی میں ہو نہ آلائش
یہی مُلّا کی پارسائی ہے

○

انسان کے لیے اس دنیا میں دشنام سے بچنا مشکل ہے
تقصیر سے بچنا ممکن ہے الزام سے بچنا مشکل ہے

طائر کے لیے دشوار نہیں صیاد و قفس سے دور رہے
لیکن جو شکلِ نشیمن ہے اُس دام سے بچنا مشکل ہے

دامن کو بچا بھی لیں شاید صحرا کے نکیلے کانٹوں سے
گلشن کے مگر گلہائے شرر اندام سے بچنا مشکل ہے

اس حادثہ گاہِ ہستی میں ٹکرائیں گے دو دل کچھ بھی کرو
پریوں کے لیے وہ لاکھ اُڑیں گلفام سے بچنا مشکل ہے

اوہام کی تاریکی تو مٹا سکتے ہیں جلا کر شمعِ خرد
لیکن خود عقل کے زائیدہ اوہام سے بچنا مشکل ہے

اے ارضِ سحر کے راہرو! منزل پہ پہنچنے سے پہلے
ہر قافلہ جس نے لوٹ لیا اُس شام سے بچنا مشکل ہے

کچھ قطرہ ہے اوپر اوپر پھر دُرد ہی دُرد اندر اندر
آغازِ محبت خوب مگر انجام سے بچنا مشکل ہے

اک خون اور گوشت کے انسان کا معبود تری جنت کی قسم
حوروں سے چرا تا آنکھ آساں اصنام سے بچنا مشکل ہے

انسان کی ہے اولاد اگر وہ ملّا ہو یا اور کوئی
ہنگامِ جوانی فلسفۂ خیام سے بچنا مشکل ہے

دلوں کو دل نہ بننے دے گا آزارِ جہاں کب تک
محبت رائیگاں ہے آج لیکن رائیگاں کب تک

لبِ خاموش ضبطِ غم کی سعی رائیگاں کب تک
تمنا بے صدا کب تک محبت بے زباں کب تک

بہارِ باغ اک بدلی ہوئی شکلِ خزاں کب تک
قفس کی تیلیوں ہی پر بنائے آشیاں کب تک

زمیں کی پستیاں ہی رفعتیں ہیں آسمانوں کی
اُبھرا ے خاک شانوں پر یہ بارِ آسماں کب تک

بشر کے وہم کے سائے ہیں گہوارے خدائی کے
ڈرے گا دیکھ کر اپنی ہی یہ پرچھائیاں کب تک

قدم رکھ راہِ اُلفت میں اکیلا ہے تو ڈر کیا ہے
تلاشِ کارواں تجھ امیرِ کارواں کب تک

چلے گی کب تلک بندوں کے برتے پر خداوندی
اُڑے گا نور ماتھوں کا فروغِ آستاں کب تک

اُلٹ کر رند بھی کچھ کہہ نہ دیں واعظ نہ چھیڑ ان کو
یہ شغلِ سنگ ساری اور شیشہ کا مکاں کب تک

کبھی ذرّاتِ خاکی بھی تو تاریخِ جہاں لکھیں
مہ و انجم کے قصوں پر مدارِ داستاں کب تک

نسیم و سبزہ و گُل کے سنہرے خواب دکھلا کر
یہ برق و باد و باراں ہی نصیبِ آشیاں کب تک

اُٹھو گھر کے دیوں ہی کو جلا کر روشن کر لو
ستاروں سے تجلّی کا سوالِ رائیگاں کب تک

فریبِ لُطف کھا کر غم نہ لے لینا کہیں مُلّا
یہ مانا مہرباں ہیں وہ مگر وہ مہرباں کب تک

○

دردآہنگِ جاں نہ ہو جائے
زندگی اک فغاں نہ ہو جائے

پھر قفس کی کوئی حسیں تیلی
پرچمِ آشیاں نہ ہو جائے

اور دنیا میں کوئی جرم نہیں
بس کوئی ناتواں نہ ہو جائے

رہنماؤں کی انتہا ہی نہیں
گُم کہیں کارواں نہ ہو جائے

ہو گیا تھی جہاں ہلاک خرد
دل اگر درمیاں نہ ہو جائے

آہ و گریہ دل غنیمت جاں
غم کہیں بے زباں نہ ہو جائے

موت اس سے بھلی کوئی طائر
خوگرِ آشیاں نہ ہو جائے

غم سے ہوتی ہے تربیت دل کی
اگر آزادِ جاں نہ ہو جائے

پھر نمودِ سحر کے پردے میں
خونِ سیّارگاں نہ ہو جائے

کون لائے جفا کی تاب اگر
کرم درمیاں نہ ہو جائے

نہیں ممکن ملیں نگاہیں دو
اور اک داستاں نہ ہو جائے

زخمِ دل کو نہ اس طرح دیکھو
خوں کہیں پھر رواں نہ ہو جائے

شیخ اس غم میں سو نہیں پاتا
کوئی دل شادماں نہ ہو جائے

مے دل اور تلخ کر مُلّا
نذرِ شیریں لباں نہ ہو جائے

○

خود اپنی چشمِ تر ہی کو بنا لیتے ہیں جام اکثر
جہاں میں تشنہ کاموں کا یوں ہی چلتا ہے کام اکثر

پلٹ کر لے لیا کرتی ہے فطرت انتقام اکثر
فرشتوں کے بھی لکھ جاتے ہیں انسانوں میں نام اکثر

ذرا یہ دورِ گلچیں جائے پھر تم پیچھے سُننا
ابھی تو نغمہ سنجانِ چمن ہیں زیرِ دام اکثر

یہ میخانے کی جنّت ہے یہاں دِل دِل سے ملتے ہیں
یہاں کے رند پینے میں بدل لیتے ہیں جام اکثر

سُنا جاتا ہے کچھ نغمے مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں
مرے ہونٹوں سے دیتا ہے کوئی اپنا پیام اکثر

بھٹک جاتے ہیں اس منزل پہ آ کر اہلِ دل کتنے
شکستِ عشق لے لیتی ہے رنگِ انتقام اکثر

نہ گھبرا دل گزر ہنستے ہوئے کوُئے ملامت سے
محبّت پر تو آیا ہی کیا ہے اتّہام اکثر

مجھے یارب اٹھا لے اِن نکوں کاروں کی دنیا سے
یہاں تقصیر کہلاتا ہے اُلفت کا سلام اکثر

کچھ اشکوں کی ہیں تحریریں تو کچھ نظروں کی تقریریں
کہانی دو دلوں کی ہو گئی ہے یوں تمام اکثر

مبارک ہو تجھے مُلّا کہ سناٹے میں راتوں کے
سُنا ہے گنگناتا ہے کوئی تیرا کلام اکثر

ستم اکثر بہ عنوانِ کرم ایجاد ہوتا ہے
چمن میں باغباں کے بھیس میں صیاد ہوتا ہے

جہاں میں کون کس کے درد پر ناشاد ہوتا ہے
فسانہ جس کا ہوتا ہے اسی کو یاد ہوتا ہے

کبھی ہارا ہے جوشِ گُل بھی دستِ جورِ گلچیں سے
نشیمن جلتے جاتے ہیں چمن آباد ہوتا ہے

نہ ہو جب تک سکت بازو میں یکساں قید و آزادی
قفس کے ٹوٹنے سے بھی کوئی آزاد ہوتا ہے

ابھی ہر بام پر اُس حُسن کے ارزاں کے نظارے ہیں
کہ جن کو دیکھ کر ذوقِ نظر برباد ہوتا ہے

وہ لمحہ جب اچانک جگمگا اٹھتی ہیں دو نظریں
نظر جب بجھ بھی جاتی ہے تو دل کو یاد ہوتا ہے

سمجھ کر جس کو اک غم کی امانت رکھ لیا دل میں
وہی خاموش نالہ حاصلِ فریاد ہوتا ہے

فقط تیشہ اُٹھا لینے سے منصب مل نہیں جاتا
جو جوئے شیر لاتا ہے وہی فرہاد ہوتا ہے

نہیں ہے صیدؔ بھی معصوم صیادی کی دنیا میں
جب اس کا داؤ چلتا ہے یہی صیاد ہوتا ہے

جہاں چاہے لے جائے سیلِ زندگی اس کو
مگر بچھڑی ہوئی کشتی کو ساحل یاد ہوتا ہے

دھرے رہ جاتے ہیں سب ہوش کے احکام اُلفت میں
وہیں خود صید جاتا ہے جہاں صیاد ہوتا ہے

کھنڈر اکثر جہاں دیر و حرم کے پائے جاتے ہیں
وہیں دیکھا گیا ہے میکدہ آباد ہوتا ہے

اُلجھ کچھ اور جاتے ہیں یہ پھندے ٹوٹ جانے سے
محبت کرنے والا بھی کہیں آزاد ہوتا ہے

غرض مندوں کی تحسیں سُننے والے یہ بھی سنتا جا
وفاکیشوں کی خاموشی سے کیا ارشاد ہوتا ہے

خوشی کیا ہے فسانہ روزِ رفتہ کا بُھلا سکنا
وہی غمگین ہوتا ہے جس کو یہ فسانہ یاد ہوتا ہے

چمن کو برق و باراں سے خطرا اتنا نہیں مُلّاؔ
قیامت ہے وہ شعلہ جو نشیمن زاد ہوتا ہے

○

جفائے دوست پر آزردگی کب تھی
نظر بجھتی تھی لیکن دل کے شعلوں میں کمی کب تھی

نہ بہہ پائیں جو دھارے پر وہ خود آئیں کنارے پر
کسی کشتی سے موجِ زندگی کو دشمنی کب تھی

خُم و مینا نے مل کر چھین لی جاموں کے حصّہ کی
تری محفل میں ساقی ورنہ صہبا کی کمی کب تھی

ہمیشہ تھیں جہاں میں رہزنی و رہبری دونوں
مگر یہ رہزنی پہلے بہ نامِ رہبری کب تھی

جفا کاروں کی ضامن تھی ستم کش کی وفا کیشی
زمیں جب تک زمیں تھی آسمانوں کی کمی کب تھی

کبھی تھک کر کہیں دم چھاؤں میں لینا ہی پڑتا تھا
مصافِ زیست میں لیکن محبّت زندگی کب تھی

کہیں حق اور دلیلوں پر ہوئے ہیں فیصلے دل کے
جہانِ حسن و اُلفت میں سلیماں گستری کب تھی

کسی شب کے سہارے تھی یہ ساری جلوہ آرائی
فلک کے ان ستاروں میں خود اپنی روشنی کب تھی

سوالِ اہلِ ساحل پر نہ چُپ رہتے تو کیا کہتے
ہمیں اپنی تباہی کی کہانی یاد ہی کب تھی

تمہاری شاعری میں زندگی ملتی نہیں مُلّاؔ
ہماری زندگی لیکن برائے شاعری کب تھی

غرورِ فتح میں جتنی جفائیں ہوتی جاتی ہیں
یہ سب کل کی لڑائی کی بنائی ہوتی جاتی ہیں
نہ جانے کون ہیں کرتے ہیں جو توبہ خطاؤں پر
ہم ایسوں سے خطاؤں پر خطائیں ہوتی جاتی ہیں
سرِ محفل سیے جاتے ہیں دیوانوں کے لب لیکن
در و دیوارِ زنداں میں صدائیں ہوتی جاتی ہیں
نزاعِ زیست ذہنوں میں ابھی گو غیر واضح ہے
محاذوں پہ رصف آرا پھر بھی رائیں ہوتی جاتی ہیں
وہ ساری مشکلیں جو راستہ روکے ہیں رہرو کا
قدم اُٹھنے لگے جب دائیں بائیں ہوتی جاتی ہیں
یہ بزمِ ہوش اک شہرِ خموشاں بن چکی ہوتی
غنیمت ہے کہ مستوں کی صدائیں ہوتی جاتی ہیں
طلوعِ صبح کی تاخیر پر یہ بے دلی کیوں ہے
یہ کیا کم ہے رو پہلی سی گھٹائیں ہوتی حاتی ہیں
بشر کو سانس لینا بھی کہیں مشکل نہ ہو جائے
کچھ اتنی آج زہریلی فضائیں ہوتی جاتی ہیں
جنابِ شیخ نے اپنا لیے دونوں جہاں ملّا
نمازیں پڑھتے جاتے ہیں خطائیں ہوتی جاتی ہیں

ملے گی سب کو مے، سنتے ہیں محفل میں خبر آئی
ابھی تک تو مگر ہم تک نہ ساقی کی نظر آئی

فلک پر حشر برپا نوریوں کی آنکھ میں شعلے
کسی خاکی کی شاید پھر کوئی اُمید بر آئی

خرد کو کروٹیں لیتے ہی گزری فرشِ گُل پر بھی
جنوں کو نیند آئی اور اکثر دار پر آئی

بشر کی سادہ لوحی تجربوں سے بھی نہیں جاتی
ذرا شب مسکرائی اور یہ سمجھا سحر آئی

پرندِ پر شکستہ کو قفس میں کون رکھتا ہے؟
اسیری جب بھی آئی ہے بہ فیضِ بال و پر آئی

مرا سینہ مرے شعلے کسی کو کیوں شکایت ہو
نظر تک جب بھی آئی ہے شعاعِ بے ضرر آئی

نہ اُٹھ آتے کسی کی انجمن سے ہم تو کیا کرتے
نہ آدابِ سخن آئے نہ تہذیبِ نظر آئی

وہ اندازِ تبسّم ہے کہ چہرہ جگمگا اٹھا
کرن جیسے کوئی نظروں کی ہونٹوں پر اتر آئی

ابھی تک تو بشر کے واسطے اس ارضِ خاکی پر
وہی اک رات پھر پھر کر بہ اعلانِ سحر آئی

قدم نظروں سے آگے پڑ رہے ہیں اُف ری بیتابی
دیارِ دوست کی نزدیک شاید رہ گزر آئی

خرد کی دوپہر میں زیست اپنی کٹ گئی مّلا
نہ شامِ مے فروش آئی نہ صبحِ چشمِ تر آئی

نرمی دلوں سے لب سے حلاوت بھی چھین لی
اس دور نے نظر سے مروت بھی چھین لی

تیوری چڑھا کے پہلے تو کہنے دیا نہ کچھ
پھر مسکرا کے دل سے شکایت بھی چھین لی

میں کر رہا تھا صبر سے غم کا مقابلہ
کی اک نگاہ اور یہ طاقت بھی چھین لی

پہلے تو ہر خطا سے کیا منع شوق کو
اور پھر ہر اک ثواب سے لذت بھی چھین لی

صیاد نے بہ عذرِ ہوا خواہیٔ چمن
سبزہ سے رنگ پھول سے نکہت بھی چھین لی

باحیلۂ درستیٔ اخلاق رند سے
وقتی سی زر خرید مسرت بھی چھین لی

کیا کہیے حشر گاہیٔ رفتارِ کارواں
تلووں سے خار چُننے کی فرصت بھی چھین لی

عمرِ دراز بادِ کلاہِ سفید نے
سر میں لطیف شے کی ضرورت بھی چھین لی

دُنیا امیر چھین چکا تھا غریب سے
جنت بچی تھی شیخ نے جنت بھی چھین لی

معتوب شمعِ اُردو کو تربت پہ رکھ دیا
پروانے پھر بھی آئے تو تربت بھی چھین لی

ملّا کو بامِ شعر پہ یاروں نے جانے نہ دی
پھر اُس سے یہ عبادت خلوت بھی چھین لی

نگاہوں سے کسی کی پھر مری مُلاّ پکار آئی
میں سمجھا تھا خزاں کا دور ہے لیکن بہار آئی

دلِ یخ بستہ سے پھر آبشارِ زندگی پھوٹی
بیاباں میں پھر اک جوئے رواں مستانہ وار آئی

خدایانِ چمن کی توڑ کر حد بندیاں ساری
لیے گُل پھر قریبِ ساخسار اک ساخسار آئی

دبایا پایا نہ جوشِ گُل کو کوئی جبرِ صیادی
ہر اک تیلی قفس کی توڑ کر مجھ تک بہار آئی

محبت کی حقیقت جملہ سامانِ طرب لے کر
خود آئی اور جتنے خواب تھے سب کو پکار آئی

میں سمجھا تھا مرا دورِ تبسم جا چکا لیکن
پھر اشکوں ہی کے تاروں پر تمنا نغمہ بار آئی

مرے نغموں کو سُن کر خلدِ گم گشتہ پکار اٹھی
میں آئی اے مرے روٹھے ہوئے پروردگار آئی

پھر آیا ایک نخلستاں رہِ ہستی کے صحرا میں
پھر اک طوفاں زدہ کشتی بہ آغوشِ کنار آئی

گزر کر شب کی ہر پُر ہول اور تاریک منزل سے
سحر کی وادیٔ خنداں سے شامِ سوگوار آئی

دعائیں دل کی پھر کچھ یوں اثر میں ڈوب کر نکلیں
کہ ہونٹوں پر مہ و انجم کے "آمین" بار بار آئی

وہی دیوانہ مُلاّ جو کبھی روتا ہی رہتا تھا
ہنسی آئی اسے اب تو یوں ہی بے اختیار آئی